تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ
مرتب
ناشر نقوی

اردو زبان اور ہندستان کی تحریک آزادی کا اٹوٹ رشتہ ہے اگر ایک طرف اردو نے مجاہدانہ رول ادا کیا ہے تو دوسری طرف اردو کی ترقی میں آزادی کی تحریک نے بھی نمایاں فرض انجام دیا ہے۔ آزادی اور اردو کے اسی باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے ہریانہ اردو اکادمی نے تاریخی سیمنار منعقد کیا اور زیر نظر دستاویزی کتاب بھی شائع کی ہے میں سمجھتی ہوں کہ یہ کتاب اردو اور مقصدِ آزادی کے فروغ میں نمایاں مقبولیت حاصل کرے گی۔

کرن اگروال

صدر اکادمی و کمشنر محکمہ تعلیمات ہریانہ

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

حصّہ اوّل

ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ سیمنار
میں پڑھے جانیوالے مقالوں کا مجموعہ۔

مرتب

ناشر نقوی

ہریانہ اردو اکادمی ۹۷۸ سیکٹر ۹ پنچکولہ ۱۳۴۱۰۸ (ہریانہ)

منتظم سیمنار ـــــ شمس تبریزی
اشاعت ـــــ ۱۹۸۸ء
قیمت ـــــ ۳۵ روپے
تعداد ـــــ ۱۰۰۰
تزئین ـــــ سید عبد الحنّان
کتابت ـــــ لقمان الرحمٰن
طباعت بالی گرافر پریس فرید آباد

زیرِ نگرانی کشمیری لال ذاکرؔ

سلسلہ ہریانوی ادب

کشمیری لال ذاکرؔ سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے بالی گرافر پریس سے چھپوا کر
ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ ـــ شائع کیا

جنگِ آزادی کے

شہیدانِ وطن کے نام

فہرست

دعائیہ

جناب خورشید احمد وزیر تعلیم حکومت ہریانہ

ہندوستان میں آزادی کی چالیسویں سالگرہ پورے احترام و عقیدت سے منائی جارہی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بھی فخر ہورہا ہے کہ آزادی کے جہاد میں اردو زبان نے بھی مجاہدانہ رول ادا کیا ہے۔ اس مجاہد زبان کے حوالے سے ہریانہ اردو اکادمی نے جس سمینار کا اہتمام کیا ہے وہ ریاست ہریانہ کے لیے قابلِ فخر ہے۔ میں ہریانہ سرکار کی طرف سے ہریانہ اردو اکادمی کے فروغ کے لیے پورا یقین دلاتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اکادمی مستقبل میں بھی ایسے ہی تعمیری اقدامات کرتی رہے گی۔

ہریانہ میں اردو کے لیے دو سال پہلے کوئی ہموار فضا نہ تھی لیکن ہریانہ اردو اکادمی کے قیام کے بعد ایسے تاریخی حقائق اور شواہد سامنے آئے ہیں جن کا اندازہ خود ہریانہ والوں کو بھی نہ تھا یعنی یہ کہ ہریانہ ہی اردو کی جنم بھومی ہے یا یہ کہ اردو کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے سلسلے ہریانہ سے ملتے ہیں۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے بھی خوشی محسوس ہورہی ہے کہ ہریانہ اردو اکادمی ہریانہ کی تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور ادبی حیثیتوں کو پہلو در پہلو اردو میں پیش کرنے کے کئی منصوبے پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہریانہ اردو اکادمی کی عمر یوں تو ابھی دو ہی سال کی ہے لیکن اس مختصر سی عمر میں اور خاص طور پر گذشتہ چھ مہینوں میں اس نے بہت سے تعمیری کارنامے انجام دیے ہیں

تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ کے تعلق سے زیرِ نظر تاریخی کتاب اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دی جاسکتی ہے جس کی مقبولیت کے لیے میں اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

مہر چند آہوجہ

اس سے پہلے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے متعلق میں اپنی یادوں کو سمیٹ کر اپنے بکھرے ہوئے الفاظ میں اپنے تجربات و مشاہدات پیش کروں۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ہریانہ سرکار و ممبران اردو اکادمی کو مبارکباد دوں کہ ہریانہ میں اردو اکادمی کی داغ بیل ڈالی۔ مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ دو برس کے قلیل عرصہ میں اکادمی نے نمایاں اور تاریخی کام انجام دیے ہیں۔ ان کی پیش قدمیوں کی مثال تحریک آزادی اور اردو سے متعلق ادبی و قومی سیمنار کا انعقاد بھی ہے۔

اردو والے ادبی سطح پر اردو کو کچھ بھی سمجھیں لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اردو نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھرپور مجاہدانہ فرض بھی انجام دیا ہے۔ ہم آزادی کے سپاہیوں کا یہ زبان اوڑھنا بچھونا رہی۔ اردو ہماری رہنما ہے۔ اردو ہماری مدعی ہے اور اردو اپنے آپ میں خود ایک تحریک ہے۔ ہماری قومی زبانوں میں سب سے زیادہ موثر نکھری ہوئی اور نازک زبان اردو ہی ہے۔ آج اس موقع پر مجھے یاد آرہی ہیں امیر شریعت مفتی کفایت اللہ صاحب حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری اور عنایت اللہ مشرقی جیسے مجاہدین آزادی کی وہ تقریریں، جو آزادی کے جذبات کو زندہ کر دیتی تھیں۔ مجلس احرار الاسلام کے جلسوں میں ان مجاہدین آزادی کی تقریریں سن کر آزادی کے قافلے آگے بڑھتے تھے اور ان قافلوں سے ابھرنے والے نعرے اردو ہوتے تھے۔

۱۹۳۸ء میں عنایت اللہ مشرقی کے ساتھ یوم فلسطین میں مَیں بھی شریک تھا۔ آزادی

کے متوالوں کے درمیان مشرقی صاحب نے مجھے موقع دیا کہ کچھ کہوں میری تقریر سننے کے بعد عوام کا تاثر تھا کہ اردو فرقوں میں نہیں بٹ سکتی۔ اردو میرے سینے سے نکل کر چنگھاڑتی تھی ۔

چکھائیں گے مزہ ۔ بربادیٔ گلشن کا گلچیں کو

آزادی کی تحریک میں ہم ہندوستانیوں پر لاٹھیاں چلتی تھیں ۔ سامراجی گھوڑوں کی ٹاپیں بے سُری آوازیں نکالتی تھیں اور ہم دہاڑتے تھے ۔

سر بریدہ تن شکستہ، ہڈیاں، لاشوں کے ڈھیر

باغیوں کو تخت شاہی پر بٹھا کر لیں گے دم

اکثر لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ آزادی کی تحریک میں ہم نے کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں اور میرا جواب ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں صعوبتوں کی داستان ہم نے فرنگی نظام کے ساتھ دفن کر دی ۔ ہم نے تو ہندوستان کو آزاد دیکھنے کا خواب دیکھا تھا، ہمیں فخر ہے کہ اس خواب کی تعبیر پالی ۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم مجاہدینِ آزادی کی جس زبان نے فرنگی حکومت کی بنیادوں میں زلزلے ڈالے وہ زبان صرف اردو تھی ۔ بلکہ یہ بھی میرا ایمان ہے کہ اردو نے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں حب الوطنی کے جذبوں کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ۔ آزادی کی داستان سناتے ہوئے مجھے اکثر یہ شعر یاد آتا ہے ۔

اپنے محبوب سے جب پیار کیا تھا میں نے

کاسہ، سر میں لہو بھر کے دیا تھا میں نے

اردو کو کل بھی ایک تحریک سمجھتا تھا اور آج بھی ایک تحریک سمجھتا ہوں ہمالہ کی بلندیوں سے گنگا و جمنا مچلتی لہروں تک اردو کی وسعتیں پھیلی ہوئی ہیں ۔ آزادی اور انقلاب کی جب مجھے یاد آتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ بنکیے بابو، ردی ٹھاکر، لوک مان تلک، بال پال اور لال جیسے قدآور مجاہدین آزادی نے جب لوگوں کو کرانتی امر ہے سمجھانا چاہا تو عوام پورے طور پر نہ سمجھ سکے لیکن جب سردار بھگت سنگھ اور بٹیکشور دت نے اسمبلی ہال میں اردو کے دو لفظ' انقلاب زندہ باد' للکارے تو ہندوستانیوں کو انقلاب

کے معنی معلوم ہو گئے۔ میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ آزادی کے لیے اور حقوق انسانی کی تحریک کے لیے زندگی کو وقف کرنا پڑتا ہے۔ انقلاب کا دیا غربت کے جھونپڑوں میں شعلہ زن ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں ہم مجاہدوں نے جذبات کا تیاگ دیا ہے۔ آج بھی میرے پاس نہ زر ہے نہ زمین اور نہ ہی میں نے شادی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں آرام طلب ہوتا تو سیماب ہو گیا ہوتا۔ انہی الفاظ کے ساتھ میں موجودہ نسل سے یہ کہوں گا کہ آزادی اور ہندوستان کا تحفظ ہمارا بنیادی فریضہ ہے۔

اس سے تم غافل نہ ہو جانا کہیں

مہر چند آہوجہ
بزرگ مجاہد آزادی، فرید آباد
(ہریانہ)

پیش لفظ

آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ بنی نوعِ انسان کے اس بنیادی حق پر جب جب طاقت و ثروت نے حملے کئے ہیں تاریخ میں انقلاب آیا ہے۔ کسی بھی سماج، کسی بھی مذہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے اس کی تشکیل و تعمیر میں حقوقِ انسانی اور بڑی طاقتوں کے درمیان تصادم ہی نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان فطری طور پر غلامی کے قید و بند کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہے۔ کسی بھی طاقت کا استبداد جبلت انسانی پر اپنا تسلط قائم نہیں کر سکتا۔

لیکن ۱۸ ویں صدی عیسوی میں ہمارے جنت نشاں ملک پر طاقت و ثروت کی ناگہانی آفت فرنگی نظامِ حکومت کی صورت میں نازل ہوئی۔ ہندوستان جو ہمیشہ ہی سے امن و سلامتی کا گہوارہ رہا ہے۔ جس کے عوام محبت و اخوت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مخلصانہ مزاج اور مہمان نوازی کی روایت کا مغربی فرنگیوں نے شیرازہ بکھیرنا شروع کر دیا۔ ان بیرونی تاجروں نے دھیرے دھیرے ہمارے ملک کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ لالچ اور دولت کا زہر ہندوستان کی محبت بھری فضاؤں میں بھرتا چلا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی عوام اپنے ہی ملک میں "غیر" ہوتے چلے گئے۔ اس غیریت کی بادِ سموم نے کچھ ایسا سلو پوائزن کا سا اثر کیا کہ ہماری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ اس غنودگی کو دیکھتے ہوئے فرنگی طاقتوں نے ہمارے پیروں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دیں۔ اور ہماری تہذیبی قدریں طاقِ نسیاں ہوتی چلی گئیں۔ اب جب آنکھ کھلی تو اس حبس بے جا میں اصل ہندوستانیوں کا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ آج بھی جب استبداد کے اس دور کی تاریخ کو ہم دیکھتے ہیں تو روح کانپ اٹھتی ہے۔

ہندوستان جو مختلف مکتبۂ خیال اور عقائد کا ایک گلدستہ تھا۔ اس کی خوشبوؤں کو فرنگی جارحیت نے مسل مسل کر رکھ دیا۔ جس ملک میں ایک قومیت کا تصور تھا فرقہ پرستی کا شکار

ہو گیا۔ بیرونی تاجروں نے ہندوستانیت کو ختم کرنے کے لیے ملک کے عوام کو ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی میں منقسم کرنے کی سازش کو پروان چڑھایا۔ ظلم کی داستان یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ فرقہ وارانہ فسادات کو خاص طور پر ہوا دی گئی تاکہ ہندوستان کے لوگ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے جائیں اور وہ اس ملک کی تہذیبی قدروں اور متمدن روایتوں کی آہنی دیواروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شگاف ڈال دیں۔ نفرتوں کے اس ننگے ناچ نے مدتوں اس ملک میں خون کی ہولی کھیلی کتنی ہی ماؤں کی گودیاں اجڑیں۔ کتنی ہی بہو بیٹیوں کی مانگوں کا سندور مٹا۔ خون کی داستان بڑی طویل ہے۔

لیکن ان تمام افراتفریوں اور نفرتوں کے باوجود بھی ہم ہندوستانی کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ کیونکہ مایوسی ہندوستانی مسلک میں گناہ تصور کی جاتی ہے۔

ظلم و ستم، استبداد و استحصال، ذات پات کا نفاق، علاقائی، نسلی اور لسانی تعصب، تعفن اور باہمی منافرت کے حبس مسلسل کے پیش نظر آخر کار ہندوستان کے ذرے ذرے سے احتجاج نے کروٹیں لینا شروع کر دیں اس احتجاج نے ہر سمت سے "مکمل سوراج" کی صدائے انقلاب بنکر پورے ملک میں گونجنا شروع کر دیا۔ بالآخر فرنگی سامراجیت کے خلاف ہندوستان کے حریت پسند عوام کے دلوں میں ملک گیر سطح پر آزادی کی تحریک کا وہ آتش فشاں پھوٹ نکلا۔ جو انگریزوں کے سفاکانہ رویئے کے خرمنوں کو پھونکتا چلا گیا۔

آزادی وطن میں ہریانہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخی تحریک کا سہرا اسی ریاست کے انبالہ شہر کے سر ہے۔ اسی خطۂ زمین کے عظیم سپوتوں نے آزادی وطن کی تحریک کو "انبالہ ٹرائلس" کا تاریخی باب دیا ہے۔

ہندوستان کی قومی زبانوں میں اردو ہی وہ واحد زبان ہے جس نے آزادی وطن کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی مصدقہ ہے کہ اردو صرف زبان ہی نہیں بلکہ خود مجاہد آزادی بھی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی مشترک تہذیب و تمدن کی ہر زمانے میں نمائندہ زبان رہی ہے۔ اسی زبان نے ہر زمانے میں سماج کے مزاج کی عکاسی کی ہے اور وطن پرستی کے جذبوں کو تقویت پہونچاتی ہے۔ اسی زبان نے سرفروشان وطن کو "انقلاب زندہ باد" جیسا ولولہ انگیز نعرہ دیا اور

اسی زبان نے محبانِ وطن کو قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بھی عطا کیا ہے۔

جہاں آزادیٔ وطن کی ابتدائی تحریکوں کو شروع کرنے کا کافی حد تک سہرا ہریانہ کے سر ہے۔ وہاں ریاست ہریانہ کو یہ بھی فخر ہے کہ حب الوطنی کی موثر اور ہمیشہ زندہ رہنے والی زبان اردو بھی اسی خطۂ زمیں پر پیدا ہوئی۔

ہریانہ کی ان متذکرہ افضلیتوں کے پیش نظر ہریانہ اردو اکادمی نے پہلی بار تحریک آزادی اور اردو سے متعلق ایک تاریخی سیمینار شہر انبالہ میں منعقد کیا تھا۔ جس کا افتتاح اس وقت کے گورنر ہریانہ اور بانی ہریانہ اردو اکادمی جناب سید مظفر حسین برنی نے فرمایا تھا۔

سیمینار رکمنی ہال انبالہ میں ۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو منعقد کیا گیا تھا جس کا موضوع "ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان کا حصہ" تھا۔ برنی صاحب نے اردو اور آزادی کے تعلق سے اپنی افتتاحیہ تقریر میں بتایا کہ اردو نے آزادی کے جہاد میں جن مجاہدوں کو پیش کیا ہے ان میں رام پرشاد بسمل، بھگت سنگھ، راجگورو اور سکھدیو کے علاوہ دوسرے محبان وطن اپنی تاریخ ساز حیثیت رکھتے ہیں۔ برنی صاحب نے کہا کہ جنگ آزادی کے دوران اردو پر برطانوی سامراج کی خصوصی نظر رہتی تھی اردو کا بہت سا ادب اسی زمانہ میں ضبط بھی کیا گیا تھا۔

سید مظفر حسین برنی نے اکادمی کی جانب سے منعقدہ اردو اور تحریکِ آزادی وطن سے متعلق موضوع کے انتخاب پر ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر کو مبارکباد پیش کی۔ اکادمی سے متعلق بانیٔ اکادمی برنی صاحب نے کہا کہ ہریانہ میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سرکار نے جو امیدیں وابستہ کی ہیں اس کی کسوٹی پر اکادمی پوری اتر رہی ہے۔ اپنی تقریر کے آخر میں برنی صاحب نے ریاست کے ادیبوں سے اکادمی کو عملی تعاون دینے کی بھی سفارش کی۔

۲۱ نومبر کو سیمینار کے پہلے اجلاس میں برنی صاحب کا استقبال اکادمی اور ہریانہ سرکار کی طرف سے جناب خورشید احمد وزیر تعلیم نے کیا۔

اپنے استقبالیہ خطبے میں جناب خورشید احمد وزیر تعلیم ہریانہ نے کہا کہ اس زبان میں ہماری انفرادی سماجی اور قومی تہذیبیں محفوظ ہیں اس لئے اس زبان کا تحفظ ہمارا فریضہ ہے ہریانہ سرکار

کی طرف سے خورشید صاحب نے اردو کے فروغ اور اکادمی کو بھرپور تعاون دینے کی بھی یقین دہانی کرائی۔

۲۱ نومبر کو دوسرا اجلاس ممتاز سیاسی رہنما اور محب اردو جناب کنہیا لال پوسوال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پوسوال صاحب اکادمی کے سابق چیرمین بھی ہیں۔ نظامت کے فرائض راقم الحروف (ناشر نقوی) نے انجام دیئے اس اجلاس کا موضوع تحریک آزادی کی رعایت سے "جب آتش جوان تھا" رکھا گیا تھا جس میں وطن کے مجاہدین آزادی نے تحریکِ آزادی سے متعلق اپنے تجربے اور مشاہدے پیش کئے۔ یہ اجلاس اس طور پر اہمیت کا حامل تھا کہ نئی نسل کو ان مجاہدین نے وطن کے لیے بہت سی تعمیری ہدایتیں بھی دیں۔ ان بزرگوں میں جناب رام لبھایا طائر کی شرکت خاص طور قابل ذکر ہے۔ طائر صاحب کی عمر اس وقت ۱۰۳ برس ہے آپ شہید وطن سردار بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے ایک ہیں ان کے علاوہ کامریڈ راجندر، جناب جین سنگھ جین، محترمہ شیلا جین، محترمہ شکنتلا سخن، جناب مہر چند آہوجہ، گیانی مہر سنگھ اور جناب پریم سنگھ پریم وغیرہ نے بھی شرکت فرمائی۔

پہلے دن کے تیسرے اجلاس میں ڈاکٹر کملیش موہن نے "تحریک آزادی کے دوران ضبط شدہ ادب"، ڈاکٹر چندر شیکھر نے "انیسویں صدی کے آخر کا اردو ادب اور تحریک آزادی" حکیم اجمل خاں نے "میواتی ادب اور تحریکِ آزادی" اور پروفیسر ستیہ پال آنند نے "ہندوستان کی آزادی" کے موضوعات پر اپنے گراں قدر مقالے پیش کئے۔

اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے فرمائی اور نظامت کے فرائض ایوانِ غالب نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب ایوب تاباں نے انجام دیئے۔

۲۱ نومبر کو منعقد ہونے والے تینوں اجلاس اپنی تاریخی حیثیت سے کامیاب رہے۔ تمام شرکاء اور ادباء کے لیے ظہرانہ کا انتظام جناب نسیم احمد ایڈمنسٹریٹر ہریانہ پنجاب وقف بورڈ انبالہ کی طرف سے کیا گیا تھا جس کے لیے اکادمی متشکر ہے۔

دوسرے روز تین اجلاس منعقد ہوئے پہلے اجلاس کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمائی، نظامت اسلم پرویز نے کی جناب ابوالفیض سحر نے

"چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری" ڈاکٹر اسلم پرویز نے "اردو احتجاج سے انقلاب تک" جناب راج نرائن راز نے "۱۹ ویں صدی کے نصف آخر کی اردو صحافت" جناب سلیمان صابر نے "اردو صحافت اور آزادی کی تحریک" جناب شاہد ماہلی نے "تحریکِ آزادی اور قومی یکجہتی" اور جناب رام لعل نابھوی نے "آزادی کی تحریک اور اردو ادب کا طنز و مزاح" کے تحت اپنے مقالے پیش کیے

دوسرے اجلاس کی صدارت جناب سلیمان صابر نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب راج نرائن راز نے انجام دئے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "عہدِ آزادی اور خواب آزادی" ڈاکٹر خلیق انجم نے "مولانا آزاد اور جنگ آزادی" ڈاکٹر کمار پانی پتی نے "لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی اور تحریک آزادی" ڈاکٹر نریش نے "تحریک آزادی میں اردو نثر کا حصہ" اور جناب شہاب جعفری نے "تحریک آزادی اور لسانی ہم آہنگی" عنوانات کے تحت اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔

تیسرے اور آخری اجلاس کے مقالہ نگاروں میں جناب پریم سنگھ پریم نے "آزادی اور ہم" کامریڈ راجندر نے "آزادی اور صحافت" ڈاکٹر ابن کنول نے "تحریکِ آزادی میں اردو ناول نگاری کا حصہ" جناب ضیاء الرحمٰن صدیقی نے "تحریک آزادی میں طنز و مزاح" اور جناب خورشید مصطفیٰ رضوی نے "جعفر تھانیسری کی خدمات اور تحریک آزادی" موضوعات کے تحت اپنے مقالے پیش کئے۔ تمام مقالجات کے دوران علمی و ادبی بحثوں کا سلسلہ بھی رہا جو سیمینار کی رونق بڑھاتا رہا۔

اس تاریخی سیمینار میں پیش کئے گئے علمی و ادبی مقالوں کو کتابی صورت میں منظرِ عام پر لانے کا ہریانہ اردو اکادمی نے جو بیڑا اٹھایا تھا۔ اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں یہ فیصلہ قارئین خود کریں گے البتہ اکادمی کو یہ فخر ہے کہ تحریک آزادی اور اردو سے متعلق تحقیقی کام کرنے والے قلم کاروں کو اس مجموعے سے کافی مدد ملے گی۔ واضح رہے کہ ہم نے مقالوں کی ترتیب میں موضوع کی اہمیت کا خاص خیال رکھا ہے۔

یوں تو ہم نے سیمینار میں شریک سب ہی مقالہ نگاروں کو بار بار یاد دہانی کے

خطوط لکھے کہ وہ اپنے مقالے برائے اشاعت اکادمی کو ارسال فرمادیں۔ لیکن کچھ مقالہ نگاروں نے ہماری درخواست پر پوری توجہ نہیں فرمائی جس کی وجہ سے ان کے مقالے شامل اشاعت نہیں ہو پائے ہم ان مقالہ نگاروں کو بھی کوئی الزام نہیں دیں گے۔ ممکن ہے ہمارے ہی خلوص میں کوئی کوتاہی رہی ہوگی۔

آخر میں ہم اکادمی کی جانب سے ان تمام مقالہ نگار حضرات کے شکر گذار ہیں جنہوں نے اکادمی کی اس دستاویزی اشاعت میں اپنے قلمی اور پر خلوص تعاون سے نوازا ہے۔

ناشر نقوی

ایڈیٹر، ہریانہ اردو اکادمی

اردو احتجاج سے انقلاب تک

ڈاکٹر اسلم پرویز

یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے نویں دہے میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے ساتھ ہوتا ہے۔ تاہم ملکی اور قومی سطح کی کوئی بھی تحریک یا جدوجہد اچانک ہی نہیں پھوٹ پڑتی بلکہ اس کے پیچھے پورا تاریخی عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اس تاریخی عمل کو اپنی تکمیل کے لیے کچھ نہ کچھ وقت ضرور درکار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر ہم اس تاریخی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے چلیں جو انڈین نیشنل کانگریس کے قیام یا جدوجہدِ آزادی کے باقاعدہ آغاز کے پیچھے کارفرما ہے تو ہمیں ایک ڈیڑھ صدی پیچھے تک لوٹ کر دیکھنا ہوگا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندستانیوں کے احساسِ غلامی کا وہ نقطۂ عروج ہے جس نے ہندوستانی ذہن میں اس سے ٹھیک ایک صدی پہلے یعنی ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد پنپنا شروع کیا تھا۔ غلامی کے احساس کے بغیر آزادی کی کوئی جدوجہد وجود پذیر نہیں ہو سکتی اس لیے قوموں کی زندگی میں انکی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کا اولین باب وہی ہوتا ہے جب ان کے ذہن میں غلامی کا احساس جاگنا شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کے ذہنی رویّوں میں تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔ رویّوں کی اس تبدیلی کو جدوجہدِ آزادی کی اوّلین کوشش کا نام بھی دیا جا سکتا ہے ان اوّلین کوششوں میں بدلتے ہوئے ذہنی رویّوں کی شہادت اور باتوں کے علاوہ ادب سے بھی مُہیا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اردو کی شاعری یہ شہادت کہاں تک بہم پہنچاتی ہے۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان اور ادب کے عروج کا زمانہ وہی ہے جو مغلوں کے زوال کا عہد ہے۔ اس حقیقت کو کسی اتفاق پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک سیدھی سی تاریخی منطق ہے۔ مغلوں کے زمانے میں سرکاری کام کاج کی زبان فارسی تھی۔ فارسی کو اس زمانے میں وہی معیار و مرتبہ حاصل تھا جو آگے چل کر انگریزی زبان کو حاصل ہوا یہاں تک کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں انگریزی دانی برتری کی علامت ہے۔ چنانچہ شمالی ہند اور خصوصاً دہلی کے قدیم شعرا اُس دور کے اعلا طبقے کے ساتھ اپنی پہچان برقرار رکھنے کے لیے اردو جانتے ہوئے بھی اپنی فارسی دانی پر ناز کرتے تھے اور فارسی میں شعر کہنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ وہ اردو میں گاہے گاہے صرف منہ کا مزا بدلنے کے لیے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن جب مغل سلطنت کی بنیادیں ہلیں اور اس کے ساتھ سماجی افراتفری کا دور شروع ہوا تو زندگی اور سماج کی ان اعلا قدروں پر کاری ضرب لگی جو دربار سے عبارت تھیں اور جن میں زبان بھی شامل تھی۔ زندگی کے طور طریقے بدلے اور تقلید کا ایک معکوس عمل شروع ہوا یعنی دربار سے باہر کی زندگی کی خصوصیات اوپر کی سطح پر نمودار ہونی شروع ہوئیں یہاں تک کہ انھوں نے قلعۂ مُعلّا کی جانب مراجعت کی جس کے نتیجے میں ایک طرف تو بادشاہوں کی زندگی سے وہ پہلا سا رکھ رکھاؤ اور ایٹی کیٹ اٹھ گیا اور دوسری طرف اردو زبان عوام کے ساتھ ساتھ مغل بادشاہوں کی توجہ کا مرکز بنی بھی اور اردوئے مُعلّا کہلائی۔ یہاں تک کہ آخری مغل بادشاہوں کی لگاتار تین نسلیں یعنی شاہ عالم ثانی آفتاب، اکبر شاہ ثانی شعاع اور بہادر شاہ ظفر بنیادی طور پر اردو ہی کے شاعروں کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مغل بادشاہوں میں آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے اور خود اردو شاعری کی تاریخ میں بھی ان کا درجہ کم نہیں ہے۔

آزادی دنیا کے ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ اور اس کے حصول کے لیے ہر زمانے اور خطۂ زمین کا انسان مختلف سطحوں پر جدّ و جہد کرتا رہا ہے۔ سب سے پہلی تو وہ جب انسان ہوش سنبھالنا شروع کرتا ہے اور خود اپنے گھر اور کنبے میں

آزادی کے لیے کسمساتا ہے اور اپنے سے پہلی نسل کے بنائے ہوئے سانچوں میں سے نکل کر نئے سانچوں میں ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ آزادی کی دوسری سطح وہ ہے جہاں معاشرے کا پس ماندہ طبقہ معاشرے کے خوش حال اور اعلا طبقے کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ایک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ کشمکش اس وقت اور شدید اور واضح ہو جاتی ہے ۔ جب بعض تاریخی حالات کی بنا پر اعلا اور خوش حال طبقہ زوال کی زد میں آنا شروع ہوتا ہے۔ یہ کیفیت آخری مغل بادشاہوں کے زمانے میں دیکھی جا سکتی ہے ۔ آزادی کی تیسری سطح وہ ہے جہاں پورا سماجی نظام کسی غیر ملکی طاقت کے تسلط میں مبتلا ہوتا ہے اور جب یہ تسلط اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو سماج کے تمام طبقے مل کر اس کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں ہوا ۔ آزادی کی یہی جنگ قومیت کے تصور کو جنم دیتی ہے اور پھر آگے چل کر قومیت کا یہ تصور حاصل شدہ آزادی کو برقرار اور مستحکم رکھنے کا ضامن ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے ایک ہی فرد آزادی کے ان تینوں محاذوں پر نبرد آزما نظر آسکتا ہے یعنی ایک جگہ وہ دو اگلی پچھلی نسلوں کی لڑائی میں ایک فریق ہے دوسری جگہ وہ دو طبقوں میں سے ایک طبقے کا فرد ہے اور تیسری جگہ وہ قومیت کا علم بردار ہے ۔ لیکن جدوجہد آزادی میں اردو زبان کے رول کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں دوسری اور تیسری سطح کو ہی ملحوظ رکھنا ہوگا اس لیے کہ پہلی سطح کی نوعیت عام طور پر انفرادی قسم کی ہوتی ہے، جب کہ دوسری اور تیسری سطحیں اجتماعی نوعیت کی ہیں ۔

ہندوستان میں اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ہی بیرونی آفات کا سلسلہ کچھ تیز ہو گیا تھا ۔ ایک طرف نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے تھے اور دوسری طرف مشرقی ساحل سے مرکز کی طرف تیزی کے ساتھ رُخ کرتی ہوئی انگریزوں کی یورش۔ مغل حکومت کم زور سے کم زور تر ہوتی جا رہی تھی جس سے اندرونی بغاوتوں کا سلسلہ بھی تیز ہو گیا ۔ عوامی زندگی میں ان تبدیلیوں سے ایک ہلچل بپا تھی جس نے اردو شاعری میں شروع ہی سے احتجاج کے لہجے کو جنم دیا ۔ یہ احتجاج اُن حالات کے

خلاف بھی تھا جن میں اوّل سے لے کر آخر تک پورا معاشرہ مبتلا تھا اور اُس نام نہاد حکمراں طاقت کے خلاف بھی تھا جس پر لوگوں کے جان و مال کے تحفّظ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ شمالی ہند کی اردو شاعری میں ابتدا ہی سے شہر آشوب کی مقبولیت غالباً اسی احتجاج کی دین ہے۔ اگرچہ جدوجہد آزادی کے تحت وجود میں آنے والا ادب بھی احتجاجی ادب ہی ہوتا ہے لیکن یہاں ہم اپنی سہولت کے لیے آزادی کی متعینہ دو سطحوں کے مطابق پہلے کو احتجاجی اور دوسرے کو واضح طور پر جدوجہد آزادی کا ادب کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے عہد سے لے کر، جس میں اردو کا شاندار اصلاحی ادب پیدا ہوا، بیسویں صدی میں جوشؔ کے زمانے تک قومی اور انقلابی شاعری کا جو شاندار دَور نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے اس کے پیچھے احتجاجی ادب کی ایک مضبوط اور خاصی طویل روایت موجود تھی۔

احتجاج جب تک روایت نہیں بن جاتا کم زور اور غیر طاقت ور رہتا ہے یعنی اس میں سر اُٹھانے کی ہمت تو ہوتی ہے لیکن سر بچانے کی طاقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب جعفر زٹلی نے فرخ سیر کی مذمت میں یہ شعر کہا :

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ تسمہ کش فرّخ سیر

تو اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ جعفر زٹلی اپنا سر تو نہیں بچا سکا لیکن اس نے شہر آشوب کی شکل میں اردو شاعری میں سر اٹھانے کی ایک روایت کو ضرور جنم دے دیا۔ چنانچہ جب احتجاج کی یہ روایت حاتمؔ اور سوداؔ کے شہر آشوبوں سے گزرتی ہوئی قائمؔ تک پہنچتی ہے تو یہ سر اٹھا کر چلنے اور سر بچا کر چلنے دونوں کی متحمل نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو شاہانِ وقت کے خلاف قائمؔ کا یہ احتجاج :

کیا یہ شہ، کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
بچا ایک آپ، ساتھ لیٹری سپاہ ہے

ناموسِ خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِّ الٰہ ہے

دہلی کی ابتدائی دَور کی شاعری میں ایہام کے فروغ کے جو بھی اسباب تھے یہاں اس طوالت میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ایہام کو یقیناً اس دَور کے شاعروں نے اس بات کا ذریعہ بھی بنایا کہ بعض تلخ حقیقتوں کا اظہار درپردہ کر سکیں۔ میرؔ بنیادی طور پر ایہام کے شاعر نہیں تھے لیکن کبھی کبھی ان کے یہاں بھی ایہام کی لطیف چَشمک ملتی ہے جیسے اس شعر میں:

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے اپنے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

میرؔ کے بے شمار اشعار ایسے بھی ہیں جن میں اس دَور کی تلخ حقیقتوں کا برملا اظہار ہے۔ فکر اور احساس کی تمام نزاکتوں کو شاعری میں برتنے کے باوجود میرؔ کا کہنا یہی تھا "پر مجھے گفتگو عوام سے ہے"

اس دور کی احتجاجی شاعری میں دیسی حکمرانوں سے بے زاری کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے خلاف غم و غصے کی لہر بھی نظر آتی ہے اس لیے کہ انھیں کی بدولت یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ مصحفی کا مشہور شعر ہے:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ تاریخ کا وہ موڑ تھا جب ہندوستان دیہاتوں کی علاحدگی، ذات پات کی تقسیم اور اس طرح کے دوسرے مناقشوں کے جال سے نکلنے کے لیے کسمسانا شروع ہو گیا تھا اور ایک سیاسی وحدت کے مبہم سے نقوش ابھرتے دکھائی دیتے تھے۔ آزادی کی جدوجہد کے اس دوسری سطح کے دور کو دبے پاؤں آتے ہوئے اس سماجی انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اگرچہ انگریزوں کے اقتصادی مفادات کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہو رہا تھا لیکن آگے چل کر ۱۸۵۷ء کے بعد اس کی بدولت جدوجہدِ آزادی

ایک واضح اور نمایاں شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔

حالی کے بارے میں یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جو ملک کی سیاسیات سے متاثر ہوئے، ۱۸۵۷ء کی بربادی پر ان کا دل جس طرح تڑپا تھا اس کے ثبوت میں ان کی کئی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ شبلی نے ان کے بارے میں یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ ہندوستان کی غلامی کا ماتم جس شاعر نے سب سے پہلے کیا وہ حالی ہی تھا۔ حالی کی اس فریاد میں اس سماجی انقلاب کی بھی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے جو اپنی تمام حشر سامانیوں کے باوجود ملک کے ایک زندہ اور تابندہ مستقبل کا اشاریہ تھا۔ ملاحظہ ہوں حالی کے یہ اشعار جن میں صرف فریاد کی لے ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کے قاری کے لیے بہت کچھ غور و فکر کا سامان بھی ہے:

کہتے ہیں مغرب سے ہوگا جب برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اٹھتی اک نظر
وہ ترقی جو چلی آتی ہے ہو جیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دست کاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

اس سماجی تخریب میں مستقبل کی تعمیر کی جو ضمانتیں پوشیدہ تھیں انھیں حالی اور ان کے دور کے شاعروں کے ساتھ اردو کے نثر نگاروں اور اخبارات نے بھی بڑے موثر ڈھنگ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ حالی ہی اردو کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنی سیدھی سادی زبان میں کھوئی ہوئی آزادی کے حصول

کے لیے سیاسی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا اس لیے کہ سیاسی اتحاد ہی قومیت کی تشکیل کا بنیادی جز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی طویل نظم حبِّ وطن کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ ہندوستان کے تمام مذہبی فرقوں کے اتحاد پر زور دیا ہے۔

جدوجہد آزادی کی چھاؤں میں اردو کا جو ادب تخلیق ہوا اس کے ایک بڑے حصے کو یقیناً ہنگامی قرار دیا جا سکتا ہے اور اردو کی ایسی بہت سی تخلیقات آج کتابوں اور رسالوں میں دم سادھے پڑی ہیں۔ ان کا تذکرہ گاہے گاہے کسی ایسے ہی موقعے پر ہو جاتا ہے جیسے آج ہو رہا ہے۔ یقیناً ایسی بہت سی تخلیقات کو میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ کی آفاقی شاعری کے مقابلے میں نہیں رکھا جا سکتا لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے ادب نے جدوجہدِ آزادی میں کیا رول ادا کیا۔ اس نے آزادی کی تحریک کو کس طرح متاثر کیا اور آگے بڑھایا۔ اس اعتبار سے یہ ادب ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور کم ازکم ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے اس کی بقا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

آج کے سیمنار کا موضوع تھا جدوجہدِ آزادی میں اردو زبان کا حصہ۔ یہاں مختصراً اردو شاعری کے حوالے سے چند باتیں کہی گئی ہیں اس لیے کہ اردو شاعری بھی اردو زبان کا ہی ایک حصہ ہے۔ تاہم ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ زبان کا دائرہ انتہائی وسیع ہوتا ہے اور پورے سماج کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ جب کہ ادب یا شاعری زبان کے مجموعی رقبے کے ایک چھوٹے سے حصے پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ زبان سماج کے افراد کے درمیان باہمی تعاون کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے کسی ملک کی سماجی یا سیاسی تحریکوں میں سب سے بڑا رول وہی زبان ادا کر سکتی ہے جس کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع ہو۔ اردو انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک پورے برِّصغیر کی لنگوا فرانکا رہی ہے اور کسی حد تک آج بھی اس کی یہ

حیثیت قائم ہے۔ ہماری جدوجہدِ آزادی نوّے برس کا ایک سماجی عمل تھا
اور ان تمام برسوں میں لنگوا فرانکا کی حیثیت سے اردو کا رول کیا رہا اس
سوال کا جواب اگر بیچ بچا کر بات کی جائے تو یہی ہوسکتا ہے کہ 'شاید
سب سے بڑا تھا'

جہدِ آزادی اور خوابِ آزادی

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

آزادی کی جدو جہد کے دوران تخلیق ہونے والے اردو ادب کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو ان لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی ہو جو نہ صرف اردو ادب سے بلکہ جہدِ آزادی کے نشیب و فراز سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی ہم ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسی بے شمار باتیں بار بار سامنے آتی ہیں جن کا ذکر نہ صرف مایوس کن حالات میں حوصلہ عطا کرتا ہے بلکہ جن کی بدولت مستقبل کی راہیں بھی جگمگا جاتی ہیں۔

اپنے ملک کی تاریخ کے تناظر میں اردو ادب کے عہد بہ عہد ارتقا پر نظر ڈالیے تو سب سے پہلی بات جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ادب کا کلاسیکی دور بھی دراصل وہی تھا جب ہندوستان اپنی آزادی دھیرے دھیرے کھو رہا تھا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔ ہر پیادہ وزیر اور ہر وزیر بادشاہ ہوتا جارہا تھا۔ ادھر یورپ کی مختلف ایسٹ انڈیا کمپنیاں ملک میں اپنا اثر بڑھانے کے لیے ریشہ دوانیاں کر رہی تھیں جن میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا پلہ بھاری تھا۔ بیرونی حملے۔ اندرونی خلفشار، درباریوں اور شہزادوں کی سازشیں، معاشی افراتفری، غرض کہ ملک کے حساس لوگوں کو بے چین کرنے والی کونسی بات تھی جو ہمارے ہاں نہیں تھی۔ چنانچہ اردو ادب میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی کشمکش کے واضح نقوش دراصل اسی وقت سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتے

ہیں جب ہم آزاد تو تھے مگر ہماری وہ آزادی ہم سے گریزپا بلکہ اپنی صورت و نوعیت سے غلامی کی نوید تھی۔ جعفر زٹلی سے لے کر غالب تک ایک نظر ڈالی جائے۔ کون سا فن کار تھا جو ان حالات سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقات میں اس المیے کو ثبت نہیں کر رہا تھا۔ میر کا یہ کہنا

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

یا جرأت جیسے رنگین مزاج شاعر تک کا یہ احساس کہ

انگریز زبانیں تو یہ رٹتے جائیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے امیر

محض اتفاق یا کوئی شاعرانہ رو نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے احساس و ادراک تھا جو اس عہد میں تخلیق ہونے والے لاتعداد اشعار کے حرف حرف سے عیاں ہے۔ غزل کے علاوہ شہر آشوب، ہجویات، رباعیات، قطعات سب اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ظلمتوں کے اس دور میں اردو ادب کے افق پر نئی آگہی کی کرنیں بھی پھوٹ رہی تھیں جو آنے والے زمانوں میں بھی روشن ذہن و احساس رکھنے والے فن کاروں کے ظہور کی بشارت دیتی تھیں۔

دنیا سے بیزاری، زندگی کی بے ثباتی، ملتوں میں اتحاد و اتفاق پر اصرار، محض فلسفیانہ موشگافیوں پر مبنی تصورات نہیں تھے بلکہ اس عہد کے روزمرّہ کے حقیقی تجربوں سے حاصل کیے ہوئے احساسات تھے۔ ہمارے شاعر اپنی نگاہوں کے سامنے بادشاہوں کے جلال و جبروت کو مٹی میں ملتا ہوا اور ان کی عشرت گاہوں کو ویران ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ میر و سودا اور ان جیسے نہ جانے کتنے شاعر و عالم اپنی سرپرستی کرنے والے رئیسوں اور امیروں کے ساتھ دربدر ہو رہے تھے۔ غالب کا یہ کہنا کہ بلب گڑھ کے راجہ کو اختیار دیا جائے گا مگر وہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ خدا نے انسان کو اسی دنیا میں دے رکھا ہے۔ یا خود غالب کی ہی سرسید کو اس قسم

کی تلقین کہ عہدِ اکبر کے آئین کو بھول کر اس تہذیب کی طرف دیکھیں جو مغرب سے طلوع ہو رہی ہے۔ قدیم دہلی کالج کے اساتذہ کی یہ کوشش کہ ہندوستان میں جدید یورپی علوم کو فروغ ہو اور قلعے کے اندر وہ ایک مدرسہ کھولیں جہاں شہزادے عیش و طرب میں وقت کاٹنے کی بجائے آدابِ جہاں بانی سیکھ سکیں معمولی واقعات نہیں ایک ابھرتے ہوئے شعور کا اشاریہ ہیں۔ جو آئندہ جدوجہدِ آزادی میں تبدیل ہونے والا تھا۔

مگر چند باشعور ہمارے شاعر و ادیب اپنے وجدان سے آنے والے کل کا جو سماں دیکھ رہے تھے وہ اس وقت کے اربابِ حکومت و سیاست کی رسائی سے دور تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان انگریز کے سامنے مکمل طور پر اپنی نام نہاد آزادی سے بھی دستبردار ہو گیا۔ اس کے بعد حصولِ آزادی کی جدوجہد کا پہلا دور آیا جب سید احمد خاں کی رہنمائی میں سماجی اصلاح کی ایک عظیم الشان تحریک کا آغاز ہوا' جس کا لازوال عکس ہمارے شعر و ادب میں محفوظ ہے۔ یہی وہ دور بھی ہے جب نہ صرف حصولِ آزادی کی جدوجہد تیزی کے ساتھ فروغ پانے لگی بلکہ اس ہندوستان کی تصویر بھی خواب و خیال میں ابھرنے لگی جو ان کے نزدیک آزادی کے بعد ظہور میں آنے والا تھا۔ حالیؔ، سید احمد خاں اور آزادؔ کے ادبی مضامین اور نذیر احمد کے ناول اگر ایک طرف اپنے عہد کی بدنصیبیوں اور محرومیوں کا احساس دلا کر ان کا حل پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف شررؔ کے تاریخی ناول اور شبلی کی تاریخی و سوانحی مضامین ماضی کے شاندار کرداروں اور کارناموں کو اجاگر کر کے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایسی خوابناک فضا پیش کرتے ہیں جو ان کے نزدیک پھر وجود میں آ سکتی ہے بشرطیکہ ان کے ہم وطنوں کے کردار بھی ویسے ہی ہو جائیں۔ پھر اقبالؔ کی شاعری اور پریم چند کی افسانہ نگاری ایک اور عہد کے شعور کی آئینہ داری کرتی ہے جب ساری دنیا میں خصوصاً ایشیا اور افریقہ میں سامراج کے خلاف جدوجہد ایک فیصلہ کن منزل میں قدم رکھ چکی ہے۔ اقبال کی شاعری میں قوت کا احترام، جدوجہد پر زور "جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا" وغیرہ ان کے عہد کی اسی صورتِ حال کا شدید ردِ عمل تھا جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد رونما ہوئی تھی۔ خضرِ راہ اور ساقی نامہ جیسی نظیں جہد

آزادی کی اس منزل کی نشاندہی کرتی ہیں، جب مشرق و مغرب، حاکم و محکوم، سرمایہ و کشمکش میں قوت و عزم کی اہمیت عیاں ہوتی ہے۔

اقبال کی بدولت مجہولیت، خانقاہیت، تقدیر پرستی، دل کی دنیا کے اندر سمٹتے چلے جانا، شبِ فراق میں تارِ بستر ہو جانا اردو شاعری کے ماضی کا حصہ بن گئے۔ اقبال کا یہ کہنا کہ

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

دراصل ایک اعلیٰ منزل ہے جہاں ہمارا ادب قومی اور عالمی سطح پر برپا ہونے والی کشاکش سے نہ صرف ہم آہنگ ہے، بلکہ اسے تیز تر کرنے کے لیے اعلیٰ تر شعور کو فروغ دیتا ہے اور بڑے سے بڑے حلقوں کو اس جدوجہد میں شریک ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔

آزادی کی جدوجہد کا ایک اہم پہلو جس کی طرف خاص طور سے نظر کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ بنیادی انسانی حقوق کی جدوجہد بھی تیز تر ہوتی ہے۔ اردو ادب میں پہلی بار اگر ایک طرف مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا میں عورتوں کے ایک بدنصیب طبقے کے استحصال کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا جاتا ہے تو دوسری طرف پریم چند کے ہاں جہیز کی لعنت اور بیوہ کی شادی جیسے مسائل پر کہانیاں ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ پریم چند کے ہاں دیہات کی پسماندگی۔ کسانوں پر زمینداروں اور سامراجی حکومت کے کارندوں کے مظالم، ذات پات کی تفریق، دیہاتوں کی پسماندگی جیسے موضوعات پر کہانیاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اب محض سامراج سے آزادی ہی کو کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے معاشی اور سماجی انقلاب کو بھی جہدِ آزادی کا لازمی جزو سمجھا جانے لگا ہے۔ دراصل ترقی پسند تحریک اور اس کی مقبولیت اسی شعور کا نقطۂ عروج تھی۔

ادب کا کام محض دستاویزی شہادتیں فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ دل و دماغ کی نازک ترین رگوں کو چھیڑنا، احساس کو بیدار کرنا۔ دکھوں میں تڑپانا اور ساری ناکامیوں کے درمیان بہتر زندگی کے خواب دکھانا بھی ہے۔ چنانچہ اردو ادب نے ہر عہد میں ہماری

انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بے چینیوں کی بھی آئینہ داری کی اور ہر زمانے میں ایک بہتر زندگی کے خواب بھی دکھائے اور ساتھ ہی ساتھ خوابوں کے ٹوٹنے کا کرب بھی جس شدت کے ساتھ اردو شعر وادب میں پایا جاتا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ہر خواب دیکھنے والے کی نیند جب ٹوٹتی ہے۔ اور اسے ارد گرد کی دنیا دوسری نظر آتی ہے تو وہ بے قرار ہو اٹھتا ہے۔ خوابوں کی سرزمین میں واپس چلا جانا اس کے بس کی بات نہیں اور حقیقی دنیا سے آنکھ چرانا بھی اس کے لیے نہیں۔ چنانچہ خواب و حقیقت کے اس تصادم کا اظہار کبھی کبھی، کسی دل دوز چیخ یا تلخ و اندوہ ناک ہنسی میں ہوتا ہے۔ آزادی کا دلکش خواب دیکھنے والے شاعروں اور ادیبوں نے جب آزادی کا سامنا کیا تو انھوں نے ملک تقسیم ہوتا ہوا ، انسانیت کا لہو پیتا ہوا ، اپنے ہم وطنوں کو بے وطن ہوتا ہوا بھی دیکھا۔ شکستِ خواب کا یہ منظر آزادی کے بعد ظہور میں آنے والے سارے ادب میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے اور زخم لگنے کے بعد سب سے تلخ اور دل ہلا دینے والی ہنسی وہ تھی جو 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' بن کر سعادت حسن منٹو کے لبوں پر اُبھر آئی۔

مولانا آزاد اور جنگِ آزادی

ڈاکٹر خلیق انجم

مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا. جو مذہبی فکر اور عقائد کے اعتبار سے روایتی اور قدامت پرست اور پیری مریدی کے سلسلے کا تھا۔ مولانا کو بچپن ہی سے عربی اور فارسی کی تعلیم دی گئی اور قرآن، حدیث، علم الکلام اور فقہ جیسے علوم پر قدرت حاصل کرائی گئی۔

مذہبی علوم نے مولانا کی فکر کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں لیکن جب مولانا نے زندگی پر نظر ڈالی تو بقول ان کے " دو تین سال تک میرے دل میں شدید بے چینی رہی اور میں اپنے شکوک کو دور کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا۔ کبھی کوئی کیفیت طاری ہوئی کبھی کوئی، اور بالآخر میں ایک منزل پر پہنچا ؛ جب کہ وہ بندشیں ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو گئیں، جو میرے خاندان اور خاندان کی فضا میں تربیت نے میرے ذہن پر لگائی تھیں مجھے محسوس ہوا کہ میں تمام رسمی اور مصنوعی رشتوں اور پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہوں، اور میں نے فیصلہ کیا کہ آگے قدم بڑھاؤں گا تو اسی راہ پر جو میں نے اپنے لیے انتخاب کی ہو۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے " آزاد " کا عرف اختیار کیا "

تبحر علمی، بصیرت، ژرف نگاہی اور فکر و نظر کی پختگی نے مولانا کو مذہب کا وہی راستہ دکھایا. جو سرسید نے دیکھا تھا. سرسید کی طرح مولانا بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا علاج وہ مذہب ہے. جو زندگی کے جدید تقاضوں کے مطابق ہو، جو فطری ہو اور کٹرپن سے آزاد ہو۔ مولانا کا عقیدہ تھا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں

اور ہر راستے پر قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ان کی سیاسی، سماجی، تاریخی اور ادبی تحریروں میں قرآن کے سب سے زیادہ حوالے ہیں۔

مولانا نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا، وہ غلامی کا زمانہ تھا۔ برطانوی سامراج ہندستان کا استحصال کر رہا تھا۔ ایک طرف سامراج خود کو مضبوط کرنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف غلام قوم آزادی کے لیے کوششیں کر رہی تھیں۔ ایسے موقع پر مولانا جیسے ذہین، حساس، ایماندار، حق پرست اور حوصلہ مند انسان کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ تحریکِ آزادی سے دامن بچائے رہتا۔ اگر مولانا اپنے موروثی طریقوں کو اختیار کرتے، تو انکی ساری زندگی عیش و آرام میں گزرتی رہتی؛ دولت، شہرت اور عزت میں سے کسی چیز کی کمی نہیں تھی، لیکن مولانا کی عظمت، انسان دوستی، عقلیت پسندی اور فکر و نظر کی بلندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنے لیے دار و رسن کا راستہ اختیار کیا۔

ان کی عمر سولہ سترہ سال تھی کہ ان کے سیاسی خیالات میں تبدیلی شروع ہوگئی۔ برطانوی سامراج کے خلاف ان کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اس زمانے یعنی ۱۹۰۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک مستقل خلیج پیدا کرنے اور ہندوستانیوں کو کمزور کرنے کے لیے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت برطانوی حکومت ہندوستانی تحریکِ آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار بنائے ہوئے تھی اور مسلمان برطانوی حکومت کی سیاسی چالوں کا شکار بنے ہوئے تھے۔ عام طور سے مسلمان برطانوی حکومت کی حمایت کرتا تھا اور آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والوں کو ملک دشمن سمجھتا تھا۔ اس لیے تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتی تھیں۔ ان جماعتوں کا عقیدہ تھا کہ مسلمان آزادی کے راستے میں رکاوٹ ہیں، انھیں اس راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کو زیادہ بلند اور مضبوط بنانے کے لیے انگریزوں نے پولیس کے خفیہ محکمے میں یوپی کے مسلمانوں کا تقرر کیا۔ مولانا پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے انگریز کی پالیسی کو سمجھ کر آزادی کی جد و جہد میں حصہ لیا۔ اسی زمانے میں بنگال

کے انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی سے ملاقات ہوئی۔ چکرورتی کی وساطت سے مولانا کی ملاقات اور دوسرے انقلابیوں سے ہوئی۔ تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی سیاسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے آربندو گھوش بڑودہ چھوڑ کر کلکتے آگئے تھے۔ مولانا کی دو تین دفعہ ان سے ملاقات ہوئی۔ انقلابی رہنماؤں سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کی وجہ سے مولانا کے دل میں انقلابی سیاست کے لیے جگہ پیدا ہوگئی۔

شیام سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے مولانا کا تعارف کرایا تو انھیں یقین نہیں آیا کہ کوئی مسلمان بھی ان کی تحریک میں شریک ہوسکتا ہے۔ اس لیے شروع شروع میں مخصوص محفلوں سے مولانا کو دور رکھا جاتا۔ کچھ ہی عرصے میں جب مولانا نے انقلابیوں کا اعتماد حاصل کرلیا تو اس تحریک کے ایک اہم رکن ہوگئے۔ انھوں نے ان انقلابیوں کو یقین دلایا کہ یہ ہرگز درست نہیں کہ تمام مسلمان ان کے دشمن ہیں۔ اگر مصر، ایران اور ترکی میں مسلمان انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں تو ہندوستان میں بھی انھیں اس تحریک میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مولانا جب اس تحریک میں شامل ہوئے تو انقلابیوں کی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود تھیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ان سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کیا جانا چاہیے۔ انقلابیوں کو یہ مشورہ ماننے میں تامل تھا، لیکن مولانا کے اصرار پر شمالی ہندوستان اور بمبئی میں اس جماعت کی خفیہ شاخیں قائم ہوگئیں۔ اس زمانے میں (۱۹۰۸ء میں) مولانا عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر پر چلے گئے اور اس انقلابی جماعت سے ان کا تعلق ختم ہوگیا۔ مولانا عراق پہنچے تو کچھ انقلابی عراقیوں سے انکی ملاقات ہوئی۔ مصر میں ان کی ملاقات مصطفےٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے بھی ہوئی۔ ان دنوں ینگ ٹرکس کے ایک گروپ نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کررکھا تھا اور یہ گروپ وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی شائع کرتا تھا۔ مولانا کے ان لوگوں سے تعلقات ہوگئے اور جب مولانا ترکی گئے تو ینگ ٹرکس تحریک کے کچھ رہنماؤں سے ان کی دوستی ہوگئی، جو ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی کئی سال تک باقی رہی۔ اس تحریک کے رہنماؤں سے گفتگو کے بعد مولانا کو یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شمولیت

ضروری ہے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ ہندوستان پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ سیاست میں حصہ لیں گے۔ مولانا کو یہ بھی احساس ہوا کہ مسلمانوں کو خواب گراں سے جگانے اور ان میں انقلابی جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری ہے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے جون ۱۹۱۲ء میں ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا۔ "الہلال" اتنا مقبول ہوا کہ دو سال میں اس کی اشاعت ۲۶ ہزار فی صفحہ تک پہنچ گئی۔ اردو صحافت کی تاریخ میں یہ پہلا ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت یہاں تک پہنچی تھی۔ مسلمانوں میں "الہلال" کی مقبولیت اور "الہلال" کے سیاسی مضامین سے حکومت خائف ہوگئی۔ حکومت نے ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو "الہلال" کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کرلی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس اقدام سے ڈر کر مولانا اپنی پالیسی بدل لیں گے لیکن ان پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے دو ہزار روپے بطور ضمانت جمع کرا دیے اور اخبار کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ حکومت نے کچھ ہی دن بعد دو ہزار کی ضمانت ضبط کرلی، اور مزید دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ بہت جلد یہ ضمانت بھی ضبط کرلی گئی۔ حکومت کا جب کوئی بس نہ چلا تو اس نے "الہلال" پریس ضبط کرلیا۔ مولانا ہمت نہیں ہارے۔ پانچ مہینے بعد انھوں نے "البلاغ" پریس قائم کیا اور "البلاغ" نام سے ایک اخبار جاری کردیا۔ حکومت بنگال نے جب دیکھا کہ مولانا پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا تو اس نے ان کو مجبور کردیا کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی کی حکومتوں نے اپنے صوبوں کے حدود میں مولانا کے داخلے پر پہلے ہی پابندی عائد کردی تھی۔ مولانا کے پاس بہار جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا، کیوں کہ اب بہار ہی واحد صوبہ تھا جس کے دروازے مولانا کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ۳۰ر مارچ کو مولانا کلکتے سے روانہ ہوئے اور رانچی پہنچ گئے۔ مولانا کے بہت سے عزیز و اقارب ان کے ساتھ جانے کے متمنی تھے، لیکن انھوں نے گوارہ نہیں کیا اور تنہا ہی اس سفر پر نکل پڑے۔ مولانا نے رانچی کے پاس مورا باری نامی گاؤں میں قیام کیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں کول، اڑاؤں اور منڈا جیسے غیر تہذیب یافتہ قبیلے رہتے ہیں۔ اس گاؤں میں چند بنگالیوں نے چار پانچ

بنگلے بنا لیے تھے اور کبھی کبھی گرمیوں میں آکر یہاں رہتے تھے۔ ان بنگلیوں میں رابندر ناتھ ٹیگور کا خاندان بھی تھا۔ اس خاندان نے ایک پہاڑی پر بنگلہ بنایا تھا۔

مولانا کی جلاوطنی ان کے دوستوں، عزیزوں اور مداحوں کو بہت شاق گزری۔ سات ہزار دستخطوں کے ساتھ حکومت کو میمورنڈم پیش کیا گیا، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مولانا پر سے کلکتے سے باہر رہنے کی پابندی ختم کی جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا میمورنڈم تھا، جس پر اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے دستخط کیے تھے۔ اس میمورنڈم کا حکومت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تقریباً ساڑھے تین مہینے بعد رمضان شریف شروع ہوگیا شہر گاؤں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جمعے کے دن مولانا شہر کی جامع مسجد گئے۔ لوگوں نے مولانا کو دیکھا تو اصرار کیا کہ وہی امامت کریں اور خطبہ دیں۔ مولانا نے خطبہ پڑھا۔ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے مولانا کی نظر بندی کے احکامات جاری کردیے۔ مولانا دن کی چار نمازیں تو مسجد میں باجماعت پڑھ سکتے تھے، لیکن انھیں رات کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اس لیے عشا کی نماز میں شریک نہیں ہوسکتے تھے' مولانا نے حکومت سے عشا کی نماز کے لیے مسجد میں جانے کی اجازت مانگی، حکومت نے اجازت نہیں دی تو مولانا نے قانون کی پروا کیے بغیر عشا کے وقت مسجد میں جانا شروع کردیا اور حکومت کے سامنے چشم پوشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مولانا نے رانچی شہر کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ انھیں مذہب اور علم کی طرف متوجہ کیا، جس کی وجہ سے اجڑی ہوئی بے چراغ مسجدوں میں روشنی ہوگئی اور وہ آباد ہوگئیں۔ انھوں نے رانچی کی جامع مسجد میں ایک سال تک قرآن شریف کا درس دیا اور ان کا زیادہ وقت تالیف و تصنیف میں بسر ہوا۔ "ترجمان القرآن" اسی زمانے میں وجود میں آیا۔ "البیان" یہیں لکھی گئی۔ "الصلوٰۃ"، "الزکوٰۃ"، "الحج"، "النکاح" نام سے فقۂ اسلامی پر یہ اہم رسالے بھی یہیں لکھے گئے۔ مولانا نے مجددینِ اسلام کے سوانح لکھنے کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیّم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوانح لکھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے منطق پر بھی ایک رسالہ لکھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ اس

زمانے میں مولانا سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ نظربندوں کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا، مولانا نے وہ وظیفہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ مولانا غیر معمولی ذہنی اور عملی سیاسی مصروفیات کے باوجود علمی اور دینی کاموں میں بھی مصروف رہے۔ رانچی میں ان کی جلا وطنی کے دن بُرے تھے، لیکن سب سے زیادہ دینی اور علمی کام انھوں نے یہیں کیا۔ اپنی سیاسی اور علمی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں "سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت جمع کروں۔ میں نامُراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔

عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زان شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام
در نشیب شکنِ زلفِ پریشاں رفتم

(ترجمان القرآن، جلد ۱، ص ۲۵)

اگرچہ مولانا کو گاندھی جی سے بہت سے معاملوں میں اختلاف تھا۔ لیکن ان سے بہت متاثر بھی تھے، خود گاندھی جی پر بھی مولانا کی شخصیت کا گہرا اثر تھا۔ جب مولانا رانچی میں نظربند تھے تو گاندھی جی وہاں آئے تھے، وہ مولانا سے ملاقات کرنا چاہتے تھے، لیکن حکومت بہار نے اجازت نہیں دی۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا دہلی آئے تو حکیم اجمل خاں کے گھر پر گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی میں خلافت کے مسئلے پر ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی طور سے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے خلافت کے مسئلے پر جو رویہ اختیار کیا تھا، گاندھی جی اور لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں نے نہ صرف اس رویّے کی تائید کی؛ بلکہ خود بھی اس جدوجہد میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک جلسہ ہوا جس میں گاندھی جی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا

عبدالباری فرنگی محل وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

گاندھی جی نے اس جلسے میں تجویز پیش کی کہ اب حکومت کو کوئی عرضداشت پیش کرنے یا حکومت کے ذمہ داروں سے کسی وفد کے ملنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں چاہیے کہ تمام سرکاری خطابات واپس کردیں، عدالتوں اور مدرسوں کا بائیکاٹ کریں، تمام ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے مستعفی ہوجائیں اور نئی بننے والی قانون ساز جماعتوں میں ہرطرح سے حصّے لینے سے انکار کردیں۔ یہی وہ تجویز ہے جسے تحریکِ عدم تعاون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی کی اس تجویز پر تمام مسلم رہنما تذبذب میں تھے اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر پائے، اس موقع پر صرف مولانا تھے، جنھوں نے گاندھی جی کی بھرپور تائید کی۔ چند ہفتے بعد میرٹھ میں خلافت کانفرنس ہوئی، جس میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کی تفصیلات بیان کیں اور مولانا نے اپنی تقریر میں اس تحریک کی تائید کی۔ کچھ عرصے بعد اس تحریک کا پروگرام تیار کرنے کے لیے گاندھی جی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ہندوستان کے دورے پر نکلے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور اور امرتسر میں پبلک جلسوں اور پبلک تقریروں پر پابندی عائد تھی۔ گاندھی جی نے ان دونوں شہروں میں تقریریں نہیں کیں لیکن مولانا نے اس پابندی کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے لیے افضلیت اسی میں ہے کہ میں خلاف ورزی کروں اور سچائی کے اعلان سے باز نہ آؤں۔ مولانا نے اعلان کردیا کہ وہ جمعہ کو لاہور کی جامع مسجد میں تقریر کریں گے۔ مولانا نے پہلے جمعہ کا خطبہ دیا، جس میں اپنے عہد کے مسائل پر گفتگو کی اور پھر نماز کے بعد مسجد کے صحن میں ترکِ موالات پر ایسی زبردست تقریر کی کہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لاہور کے نیم سرکاری اخبار "سول اینڈ ملٹری" نے لکھا کہ: "اس کارروائی کے ذریعہ علانیہ اہلِ پنجاب کو قانون شکنی کی دعوت دی گئی ہے"۔ ایک ہفتے بعد مولانا نے امرتسر کی جامع مسجد میں خطبہ دیا اور نماز کے بعد پھر تقریر کی۔

کراچی خلافت کانفرنس میں جو ریزولیوشن منظور ہوئے تھے اس کی بنا پر مولانا

محمد علی اور شوکت علی اور بعض دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ علی برادران ۱۴/ اگست کو کراچی میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ خبر ۱۸/ اگست کی صبح کلکتے پہنچی۔ مولانا نے اسی وقت کلکتے کے ہالیڈے پارک میں جلسے کا اعلان کیا۔ شام کو جب یہ جلسہ ہوا تو بیس ہزار لوگوں سے زیادہ کا مجمع تھا۔ اس کے بعد دہلی میں مرکزی جمعیۃ العلما اور خلافت کمیٹی کے جلسے ہوئے۔ مولانا نے ان دونوں جلسوں میں تقریریں کیں اور کراچی ریزولیوشن کی حمایت کی اور یہ تجویز بھی پیش کی "چونکہ گورنمنٹ نے اس اسلامی حکم کی تبلیغ کو جرم قرار دیا، اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اب اس کے اعلان میں اپنی جان لڑا دے اور ہر مقام پر اس غرض سے جلسے منعقد کیے جائیں" مولانا کی یہ تجویز منظور ہوئی اور تمام ہندوستان میں ایسے جلسوں کا تانتا بندھ گیا، جن میں کراچی ریزولیوشن کی حمایت کی گئی۔

دہلی کے بعد مولانا کراچی، بمبئی، آگرہ وغیرہ گئے اور وہاں بھی اسی طرح کی تقریریں کیں۔ بنگال میں سب سے پہلے ۱۰/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا اور سی، آر، داس گرفتار ہوئے۔ سی، آر، داس کو چھ مہینے کی سزا ہوئی، لیکن مولانا کا مقدمہ کافی دن تک چلتا رہا، ایک سال کی سزا ہوئی، لیکن یکم جنوری ۱۹۲۳ء تک مولانا کو رہا نہیں کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں گیا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں کانگریسی لیڈروں میں شدید اختلاف ہو گیا۔ سی، آر، داس؛ موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں نے سوراج پارٹی قائم کر لی۔ یہ پارٹی چاہتی تھی کہ ہندوستانی حکومت کی بنائی ہوئی کونسلوں میں داخل ہوں۔ اس کے برعکس گاندھی جی اور ان کے پیرو اس کے خلاف تھے۔ مولانا جب رہا ہو کر آئے تو انھوں نے ان دونوں گروہوں میں سمجھوتے کی کوشش کی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا ایک خاص سیشن ہوا۔ جس میں ان دونوں گروہوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ چوں کہ دونوں گروہوں کو مولانا پر اعتماد تھا، اس لیے مولانا سے اس سیشن کی صدارت کے لیے کہا گیا۔ کانگریس کے اب تک جتنے صدر منتخب ہوئے تھے ان میں مولانا سب سے کم عمر تھے۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس (۳۵) سال تھی۔

۱۱ر اپریل ۱۹۲۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے چیف سکریٹری گورنمنٹ آف بنگال دارجلنگ کو ایک خط لکھا۔ جس میں بیان کیا گیا تھا کہ" میں نے پچھلے تین سال میں کئی دفعہ یورپ اور انگلینڈ جانے کے لیے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تھی۔ میں نے ان درخواستوں کے ساتھ اپنے طبّی مشیروں کے سرٹیفکیٹ بھی منسلک کیے تھے۔ ان مشیروں کا کہنا ہے کہ مجھے علاج کے لیے یورپ جانا چاہیے، افسوس ہے کہ حکومت نے طبّی سرٹیفکیٹ پر غور نہیں کیا اور مجھے پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے پچھلی دفعہ حکومت کو یقین دلایا تھا کہ میرا یورپ کا دورہ محض طبّی علاج اور تبدیلئ آب و ہوا کے لیے ہے۔ میں یہ بات لکھ کر دے سکتا ہوں کہ میرے اس دورے کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ۲۵ر اپریل ۱۹۲۵ء کو قیصر ہند اسٹیمر کے ذریعے بمبئی سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔

مولانا آزاد کا پاسپورٹ کے سلسلے کا فائل محفوظ ہے۔ یہ فائل ایک عام آدمی کا نہیں بلکہ بیسویں صدی کے عظیم عالم، ادیب، نقاد اور سیاسی رہنما کا ہے۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں جن کا پہلی بار ہم کو علم ہو رہا ہے۔ یہ فائل بنگال کے مشہور اردو ادیب اور انجمن ترقی اردو ہند کے مجلس عام کے رکن جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی دریافت ہے۔ مولانا نے دہشت پسندوں کے ساتھ اپنی وابستگی کا خود INDIA WINS FREEDOM میں ذکر کیا ہے لیکن یہ زمانہ ۱۹۰۵ء کا ہے اور اس زمانے میں مولانا کی وابستگی سبھاش چندر بوس، شیام سندر چکروری وغیرہ سے تھی جبکہ اس فائل میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے، مولانا کی ان سے وابستگی کا اس سے پہلے ہمیں علم نہیں تھا۔

میں چاہتا ہوں کہ اس فائل پر ایک سرسری سا تبصرہ کر دوں۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۲۵ء کو مولانا نے حکومت کو جو خط لکھا تھا اور جس کے مضمون کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ اس فائل کا پہلا خط ہے۔ دوسرے ہی دن یعنی ۱۲ر اپریل ۱۹۲۵ء کو مولانا نے حکومت بنگال کے چیف سکریٹری کو ایک اور خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ" وہ کارلس آباد جانا چاہتے ہیں۔ کارلس برگ نہیں۔ پچھلے خط میں انھوں نے غلطی سے کارلس برگ لکھ دیا ہے"

مولانا نے اس خط میں غلطی کی تصیح کی درخواست کی تھی۔

اس فائل میں تیسرا نوٹ ۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء کا ہے۔ یہ کسی سرکاری افسر نے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام لکھا ہے۔ اس نوٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۳ء میں بھی پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تھی اور ہوم ڈیپارٹمنٹ نے اپنے خط مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۲۳ء کے ذریعے مولانا کو اطلاع دی تھی کہ انھیں پاسپورٹ نہیں دیا جاسکتا۔ مولانا نے مئی ۱۹۲۴ء کو حکومت کے اس حکم کے خلاف ایک احتجاجی خط لکھا تھا۔ حکومتِ ہند نے ۱۰ جولائی ۱۹۲۴ء کے ایک عام حکم نامے کے ذریعہ بنگال حکومت کو پھر ہدایت دی کہ مولانا کو پاسپورٹ نہیں دیا جانا چاہیے۔

۲۵ اپریل کا ایک نوٹ ڈپٹی سکریٹری کے نام ہے۔ اس نوٹ میں اطلاع دی گئی ہے کہ "آزاد کی حالیہ سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک خفیہ نوٹ منسلک کیا جارہا ہے۔ اس نوٹ کی روشنی میں آزاد کو پاسپورٹ دینے کی سفارش کرنا درست نہیں ہوگا۔" اس کے بعد سہروردی کا ایک خط ہے جو مسٹر گومز کے نام ہے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ "میرے (سہروردی) ایک دوست مولانا ابوالکلام آزاد علاج کے لیے ہندوستان سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ ان سے متعلق ضروری معلومات کرلی گئی ہیں، وہ ۶ جون کو پی' او' بوٹ سے جانا چاہتے ہیں۔" سہروردی صاحب نے اس خط میں پوچھا ہے کہ کیا ۶ جون سے پہلے مولانا کو پاسپورٹ مل جائے گا۔ غرض اس کے بعد کئی سرکاری افسروں کے نوٹ اور خطوط اس خط میں شامل ہیں۔ یکم جون ۱۹۲۵ء کے ایک نوٹ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے پاسپورٹ کی درخواست منظور کرلی گئی ہے۔ پاسپورٹ کی ایک کاپی بھی اس فائل میں موجود ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کو پاسپورٹ دے دیا گیا یا نہیں کیونکہ ۶ جون کے ایک اور نوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کو مولانا کی ایسی سیاسی سرگرمیوں کا پتا چلا کہ جس کی بنیاد پر انھیں پاسپورٹ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ۶ جون کا ایک ٹائپ کیا ہوا نوٹ اس فائل میں شامل ہے، جس کی پیشانی پر قلم سے (SECRET) لکھا گیا ہے۔ اس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مولانا آزاد کا ۱۹۲۲ء نے

او اخر میں ایسی خفیہ تنظیموں سے گہرا تعلق تھا جو پان اسلامزم کے لیے کام کر رہی تھیں۔ مولانا کا افغانستان کے ایجنٹوں کے ذریعے انگورا کے قوم پرستوں سے تعلق تھا۔ اس وقت مولانا ڈاکٹر کچلو کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ مولانا پورنا داس اور بنگال کے دوسرے انقلابی رہنماؤں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے شروع میں جب مولانا اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تو ان کی انقلابی سرگرمیاں بھی متاثر ہو گئیں۔ پھر مولانا نے سوراجیوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور وہ اس تنظیم کے اندرونی حلقے میں شامل ہو گئے۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی خفیہ تنظیموں کا معیار اتنا بلند کیا جائے کہ وہ ہندو انقلابیوں کے ہم پلّہ ہو سکیں۔ مولانا نے اپنے دوست کو خط لکھا تھا جو ۳ر جون ۱۹۲۴ء کو حکومت کے ہاتھ آ گیا۔"

یہ خط اور اس کے متعلق ایک سرکاری نوٹ مولانا کی سیاسی شخصیت پر بہت اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ خط ۳ر جون ۱۹۲۴ء کو اپنے دوست عبداللہ ہارون کو اردو میں لکھا تھا۔ فائل میں اس کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ انھوں نے اس خط میں لکھا ہے کہ میں آج کل ایک اسلامی اور قومی کام میں مصروف ہوں، جس کے لیے آپ سے مالی تعاون کی ضرورت ہے۔ مولانا نے لکھا کہ انھیں فوری طور پر پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے اور چوں کہ ایک بہت اہم کام کے لیے یہ رقم درکار ہے اس لیے وہ اور دوستوں سے یہ رقم نہیں مانگ سکتے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر آپ قومی خدمت کے لیے یہ رقم بطور عطیہ نہیں دے سکتے تو بطور قرض دیدیجیے، میں چھے سات مہینے میں واپس کر دوں گا۔ یہ خط کلکتے سے لکھا گیا تھا۔

سب سے آخری تقریباً تین صفحے کا ایک طویل نوٹ ہے۔ جس میں مولانا کے بقول برطانوی حکومت سیاسی سرگرمیوں اور اس کام میں ان کے ساتھیوں کا ذکر ہے۔ اس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۱ء سے مسلمانوں کی ایک خفیہ تنظیم بنائی تھی۔ اس کام میں ان کے جو ساتھی تھے، وہ اس تنظیم کی ترقی اور فروغ اور عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بنگال کا دورہ کرتے تھے۔

اردو صحافت اور آزادی کی تحریک

محمد سلیمان صابر

اردو صحافت اور آزادی کی تحریک کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی تک اردو صحافت نے جدّوجہد آزادی اور قومی اتحاد کی تحریک میں جو نمایاں رول ادا کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہ اردو صحافی ہی تھے جو سب سے پہلے برطانوی سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنے اور انھوں نے نہ صرف یہ کہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ بہت کچھ مالی قربانیاں بھی دیں لیکن انگریز کا جبر وتشدّد ان کے جذبہ حریت کو نہ دبا سکا۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریز کے خلاف پہلی جنگ آزادی لڑی گئی تو اس وقت اردو صحافت کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ مختلف شہروں سے بے شک متعدد اخبارات اور رسائل شائع ہو رہے تھے لیکن نہ تو انھیں آج کی طرح ضروری وسائل ہی میسّر تھے اور نہ انھیں لکھنے کی آزادی حاصل تھی۔ اس کے باوجود چند ایسے اخبارات تھے جنھوں نے بڑی جرأت وبے باکی سے عوام کے شعور کو بیدار کیا اور ان کے اندر آزادی کی اسپرٹ پیدا کی۔ ان اخبارات میں دہلی اردو اخبار کا نام سرفہرست ہے۔ جو علاّمہ محمد حسین آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر، ۱۸۳۷ء سے نکال رہے تھے۔ جب بہادر شاہ ظفر کی زیر قیادت ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی مولوی محمد باقر بادشاہ کے مشیروں میں شامل تھے اور انھوں نے اس جنگ میں کھلم کھلا شاہ ظفر کی حمایت کی تھی اور انگریزوں کے خلاف مضامین لکھے تھے۔ اس کی پاداش میں انگریز کا جب

دوبارہ تسلط قائم ہوا تو اس نے مولوی محمد باقر کو شہید کر دیا۔ ایک اور اخبار صادق الاخبار تھا وہ بھی بڑا جری اور بے باک تھا جو کھل کر انگریزی تسلط کے خلاف لکھتا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک خفیہ اخبار نکالنے کی اجازت خود بہادر شاہ ظفر نے بھی دی تھی۔ جس نے عوام کو بادشاہ ظفر کے اس پیغام سے روشناس کرایا کہ "اس ملک میں خواہ کیسی ہی حکومت قائم کرلو، لیکن ان فرنگیوں کو یہاں سے نکال دو" تحریک آزادی کو اس سے بڑا حوصلہ ملا۔

انگریز کے خلاف اس پہلی جنگِ آزادی کی بڑی طویل داستان ہے جو نہ اس وقت موضوع بحث ہے اور نہ اس کی اس مضمون میں گنجائش ہے۔ مختصر یہ کہ آزادی کی یہ پہلی جنگ ناکامی پر ختم ہوگئی اور پھر ایک طویل عرصہ تک ملک میں جمود کی فضا چھائی رہی۔

بالآخر ایسا وقت آیا جب اس جمود کو توڑنے کے لیے سیاسی محاذ کے ساتھ ساتھ صحافت کے محاذ پر بھی کاری ضرب لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور بڑے بڑے صحافی میدان میں آئے جنھوں نے اپنی پرجوش تحریروں سے انگریز کے خلاف عوام کے جذبات کو ابھارنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور چونکہ اردو زبان انگریزی کے بعد اس وقت بھی ملک پر چھائی ہوئی تھی اس لیے ظاہر ہے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا اعزاز بھی سب سے پہلے اسی اردو زبان کو حاصل ہوا۔ اور بڑے بڑے پایہ کے اردو صحافیوں نے جو بعد کو سیاسی رہنما بھی بنے۔ اپنے پرجوش ترشحات قلم سے ملک میں ایک عظیم انقلاب لانے کی داغ بیل ڈال دی اور اس مقصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

یہ بیسویں صدی کے آغاز کی بات ہے جبکہ ابھی برطانوی تسلط کی نصف صدی بھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں ہمیں سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ نظر آتا ہے جو انھوں نے علی گڑھ سے نکالا —— یہ اگرچہ ادبی رسالہ تھا لیکن اس کے سیاسی مضامین انگریزی نقطۂ نظر سے باغیانہ تھے جس سے انگریز حکمرانوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ اس اخبار سے ضمانتیں طلب کی گئیں، اس کا پریس ضبط کیا گیا اور اثاثہ نیلام کر دیا گیا

یہی نہیں بلکہ مولانا کو سزائے قید بھی دی گئی لیکن انگریز کا یہ جبر و تشدد مولانا کے جذبۂ حریت کو دبا نہ سکا اور کسی نہ کسی حالت میں وہ اپنے اخبار کو ۱۹۴۲ء تک نکالتے رہے۔

۱۹۰۷ء میں الٰہ آباد سے ہفتہ وار سوراجیہ شائع ہونا شروع ہوا جو اس وقت کا سب سے زیادہ سرگرم اور باغی اخبار تھا اس کے پہلے ایڈیٹر شانتی نرائن بھٹناگر تھے۔ اس اخبار کے سب ہی ایڈیٹروں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اور اس کے بعد بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علیخاں جیسی شخصیتیں میدانِ صحافت میں نظر آئیں جنھوں نے پوری قوم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار ہمدرد دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ انگریزی کا کامریڈ اخبار وہ پہلے ہی نکال رہے تھے۔ ان اخبارات کے ذریعہ انھوں نے عوام کو انگریزی سامراج کے خلاف صف آرا ہونے کا پیغام دیا اور خاص طور سے مسلمانوں کے جذبات کو بیدار کرنے کے لیے مذہب کا واسطہ بھی دیا اور کہا "ایسی خدا فروش حکومت جو خلافتِ اسلامیہ سے برسرِ پیکار ہو اس سے اور اس سے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔"

اسی زمانہ میں مولانا آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار الہلال کے ذریعہ جو صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے بہترین صحیفہ تھا میدان صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس اخبار کا خاص مقصد ملک کے مسلمانوں کے جمود کو توڑنا اور ان کے اندر سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنا تھا تاکہ وہ برادران وطن کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ مولانا نے انہیں تلقین کی کہ وہ بے خوف ہو کر برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کام کریں اور انگریز کے خلاف جدوجہد میں پرجوش طریقہ پر حصہ لیں۔ لکھتے ہیں:

> "میں نے ۱۹۱۲ء میں اردو جرنل الہلال جاری کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کے بجائے ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ خلافت اور سوراج میں ہے۔"

اسی طرح مولانا ظفر علی خاں نے بھی اپنے اخبار "زمیندار" میں بڑی بے باکی اور جرأت و

ہمت کے ساتھ انگریز کے خلاف لکھا۔ ان کی تحریریں بڑی شعلہ بار ہوتی تھیں اور انگریزی حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت ۔ چنانچہ ان کے اخبار سے بار بار ضمانتیں طلب کی گئیں اور ایسی رکاوٹیں ڈالی گئیں کہ اخبار بند ہو جائے لیکن انھوں نے تمام حالات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور کبھی ہمت نہ ہاری ۔ نظم و نثر دونوں میں انھوں نے ہندوستانی عوام کے دلوں کو گرمایا اور انھیں تلقین کی کہ وہ انگریزوں کے خلاف صبر و استقلال کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں اور اس کے مظالم سے نہ گھبرا جائیں ۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جتنا زیادہ مظالم ڈھائے گا اتنا ہی جلد اُس کا خاتمہ عمل میں آئے گا۔ جلیانوالہ باغ میں حریت پسندوں کا جو خون بہا اس میں انھیں اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی بوندیں نظر آئیں۔ ان کا یہ شعر مقبولِ عام ہوا۔

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں آئیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی

مولانا ظفر علی خاں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور نثر کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی اپنے اخبار کے ذریعہ عوام کو آزادی کا پیغام پہونچایا ۔ وہ وطن کی محبت میں سرشار تھے ۔ درحقیقت وطن سے انھیں عشق تھا لکھتے ہیں :

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

زمیندار نے اپنے قارئین کا ایک بڑا حلقہ بنا لیا تھا اور لوگ ہر روز اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے ۔ یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا جہاں سے بہت سے دوسرے اخبارات بھی شائع ہوتے تھے ۔ ایک طرح سے یہ شہر اردو کے قومی اخباروں کا مرکز بن گیا تھا جو تحریکِ آزادی کو آگے بڑھانے کا فرض انجام دے رہے تھے ۔ بندے ماترم، پرتاپ ۔ ملاپ اور ویر بھارت وغیرہ دوسرے اخبارات تھے جو اسی شہر سے شائع ہوتے تھے ۔ بندے ماترم نے جو لالہ لاجپت رائے کی سرپرستی میں نکالا گیا تھا تحریکِ آزادی کا حلقہ وسیع کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ اس میں لالہ لاجپت رائے اور ان کے معاونین

کے پُرجوش مضامین خصوصیت کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ زمیندار کی طرح اس سے بھی ضمانتیں طلب کی گئیں اور اس کو بند کرانے کی کوششیں کی گئیں لیکن یہ اخبار تمام مشکلات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا۔

اخبار پرتاپ مہاشہ کرشن نے ۱۹۱۹ء میں اس وقت نکالا تھا جب مہاتما گاندھی نے دہلی میں ستیہ گرہ شروع کیا تھا، اپنے ابتدائی دور میں وہ تحریک آزادی کا نقیب تھا۔ مہاشہ کرشن کا اپنا انداز تھا وہ اپنی تحریروں میں انگریز کے خلاف بڑی سخت تنقید کرتے تھے۔ ملاپ بھی جس کے ایڈیٹر و مالک مہاشہ خوشحال چند خورسند تھے، تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ مہاشہ جی کئی بار گرفتار ہوئے اور دو بار اخبار کی ضمانت ضبط ہوئی۔ بعد میں ان کے صاحبزادے رنبیر جی نے جو ایک انقلابی کارکن تھے، اپنی پرانی روایت کو قایم رکھا اور جب تک زندہ رہے، یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہ اخبار آج بھی دہلی سے نکل رہا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنی پرانی روش پر قائم ہے — ویر بھارت ۱۹۲۸ء میں لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی پالیسی بھی قوم پرورانہ تھی۔ وہ کانگریس کا حامی اور ہندو مہاسبھا کا مخالف تھا۔ اس اخبار میں پنڈت میلہ رام وفا کی نظمیں "فرنگی سے خطاب" شائع ہوتی تھیں۔ ان نظموں کی بنا پر اس اخبار کے ۲۲ ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ ایک اور پرانے اخبار "اخبارِ عام" کا بھی اس موقع پر ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور بہت پہلے یعنی ۱۸۷۱ء میں پنڈت مکند لال اور ان کے چچا پنڈت گوپی ناتھ نے لاہور سے نکالنا شروع کیا تھا اور شاید ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ اس اخبار نے اس وقت سیاسی بیداری پیدا کی جب پوری قوم سوئی ہوئی تھی اور انگریزی سامراج کو اپنی معمولی مخالفت بھی گوارا نہ تھی لیکن یہ "اخبارِ عام" کی جرأت تھی کہ اس نے اس وقت اس حکم کے خلاف احتجاج کیا تھا کہ "انگریز افسر کو ہندوستانی اپنی ٹوپی اتار کر سلام کیا کریں"۔ منشی محبوب عالم کے اخبار "پیسہ" نے بھی دھوم مچادی تھی جو بدیشی حکومت کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتا تھا۔

حصولِ آزادی سے کچھ عرصہ قبل لاہور سے نکلنے والے اخبار "زمزم" نے بھی عوام میں

آزادی کا زبردست جوش و خروش پیدا کیا۔ اس وقت اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط تھے۔ انھوں نے ایسے شعلہ بار اداریے سپرد قلم کیے کہ استعماری ایوانِ حکومت میں زلزلہ سا آگیا۔ اخبار پر پابندی لگادی گئی اور مولانا فارقلیط دہلی واپس آگئے۔ چند روز کے بعد ملک تقسیم ہوگیا اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ اس اخبار کی اشاعت ممکن نہ رہی۔ اس لیے کہ یہ اخبار جہاں انگریز کے لیے شمشیر برہنہ تھا وہاں وہ مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کا بھی حامی نہ تھا۔

آزادی سے قبل دہلی سے نکلنے والے اخباروں میں الجمعیۃ، انصاری اور تیج نظر آتے ہیں جنھوں نے تحریکِ آزادی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ الجمعیۃ کے عملہ ادارت سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (بانیٔ جماعتِ اسلامی)، مسٹر ہلال احمد زبیری اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے مشہور صحافی وابستہ رہے۔ یہ اخبار جو جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان تھا شروع سے کانگریس کا حامی تھا اور آزادی کے کاز کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا۔ حصولِ آزادی سے بہت پہلے یعنی ۱۹۲۹ء میں حکومت کی چیرہ دستیوں کی بنا پر وہ بند ہوگیا اور صرف آزادی کے بعد ہی نکل سکا۔ اسی دوران ہلال احمد زبیری نے الجمعیۃ سے الگ ہوکر ڈاکٹر انصاری مرحوم جو کانگریس کے عظیم رہنما تھے ان کی یاد میں انصاری نام کا اخبار دہلی ہی سے نکالا۔ اس اخبار نے بھی کانگریس کی کھل کر حمایت کی جو اس وقت حکومت سے لڑنے والی واحد بڑی سیاسی پارٹی تھی۔ اسی طرح اخبار تیج نے جو سوامی شردھانند کی یاد میں نکالا گیا تھا قومی تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنا فرض ادا کیا اور پُر جوش مضامین لکھ کر عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ یہی فرض بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ نے بھی انجام دیا اور آزادی کی تحریک میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔ اس اخبار سے بھی پایہ کے صحافی وابستہ رہے جنھوں نے اپنے ترشحاتِ قلم سے برطانوی حکومت کے ایوانوں کو لرزا دیا۔ نصر اللہ خاں عزیز، حامد الانصاری غازی، مولانا محمد عثمان فارقلیط، اور مولانا بدر جلالی جیسے ٹکسالی اردو میں لکھنے والوں نے اس اخبار کے ذریعہ قوم کو مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے میدان میں آنے کے لیے تیار کیا۔

کلکتہ سے بھی متعدد قومی اخبارات شائع ہوتے تھے جو آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان اخبارات میں روزنامہ ہند کا نام خاص طور سے لیا جائے گا جسے مولانا آزاد کے صحافی رفیق عبدالرزاق ملیح آبادی نکالتے تھے۔ روزنامہ ہند سے الگ ہوجانے کے بعد انھوں نے ہفتہ وار اخبار "اجالا" نکالا۔ اور یہ بھی حریت پسندوں کا ترجمان تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں بمبئی سے بھی متعدد اخبار جاری ہوئے مثلاً "ہندوستان"۔ "آفتاب"۔ "جمہوریت"۔ "اقبال" اور "انقلاب" وغیرہ۔ ان سب نے آزادی کے کاز کو آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ مختلف مقامات سے شائع ہونے والے مختلف رسائل نے بھی قوم کو بیدار کرنے کا فرض انجام دیا۔ ان میں دیا نرائن نگم کا "زمانہ" ساغر نظامی کا "ایشیا"۔ انیس الرحمان کا "نئی دنیا" جوشؔ ملیح آبادی کا "کلیم" سیمابؔ اکبرآبادی کا "شاعر"۔ عزیز حسن بقائی کا "حریت" اور دیوان سنگھ مفتوں کا "ریاست" قابلِ ذکر ہیں۔

قومی اور آزادی پسند اخبارات میں صرف مضامین ہی نہیں بلکہ پُرجوش قومی و اصلاحی نظمیں بھی شایع ہوتی تھیں کہ وہ آزادی کے جذبات کو ابھارنے اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا جذبہ پیدا کرنے میں تیر بہدف نسخہ کا کام کرتی تھیں۔ اردو کے بڑے بڑے پرجوش قومی شعراء نے قوم کی اصلاح اور ان کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اردو اخبارات ان کا پیغام آزادی عوام تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

اس طرح پورے ملک میں اردو صحافت کے ذریعہ آزادی کی فضا پیدا ہوئی۔ جمیل مظہری کی نظم "اے مادر ہندوستان"۔ آنند نرائن ملا کی "زمین وطن" سیماب اکبرآبادی کی "ہندوستان" ساغر نظامی کی "ترانۂ وطن" افسر میرٹھی کی "وطن کا راگ" ذوالفقار انبالوی کی "ترانۂ جنگ"۔ "میدان جنگ میں ہم اور" مجبوریاں" اور ٹیکا رام سخن کی "نفرتِ دشمن"، جوشؔ کی نظم "وطن" "آثار انقلاب" اور "لمحہ آزادی" اور تلوک چند محروم کی متعدد قومی نظمیں تھیں جن سے ملک میں انقلابی جذبات کو ابھارنے میں مدد ملی۔ اور جذبۂ آزادی میں سرشار نوجوان ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوگئے اور رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ جیسے

آزادی کے متوالے، جن کے اندر حقیقی معنوں میں سرفروشی کی تمنا تھی یہ کہہ کر تختۂ دار پر چڑھ گئے کہ

"سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں"

یہ جوشِ جنوں بڑھتا گیا اور آزادی کی تحریک ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔ انگریز گھبرا گیا اور بالآخر اس نے راہ فرار اختیار کی۔

تیور جو اسیروں کے بدلے صیاد کی ہمت ٹوٹ گئی
اے ذوقِ جنوں تیرے صدقے زنجیر غلامی ٹوٹ گئی

اس طرح اردو صحافت تحریک آزادی کو پروان چڑھانے میں پیش پیش رہی اور آج بھی وہ ملک کی آزادی کو مستحکم اور پائیدار بنانے کی کوششوں میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود اردو ابھی تک اپنا وہ حق حاصل نہ کرسکی جس کی کہ وہ مستحق تھی۔

تحریکِ آزادی اور

انیسویں صدی کے اردو اخبارات کا کردار

راج نرائن راز

انیسویں صدی کے آغاز کے بعد جیسے جیسے کمپنی بہادر کو ہندوستان میں ترقی اور عروج حاصل ہوا ویسے ویسے ہندوستان کی سیاسیات، سماجی ثقافتی زندگی اور اقتصادیات پر انگریزی غلبے و استحصال کے سائے گہرے ہونے لگے۔ بے اطمینانی اور بے بسی کا احساس گہری نراجیت میں تبدیل ہونے لگا۔ غیر ملکی اثرات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہر شے مٹھی سے ریت کی طرح سرکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑھتی ہوئی بے چینی مزید انتشار کا سبب بنی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب بپا ہوا۔ غیر ملکی غلبے سے نجات پانے اور آزادانہ زندگی میں سر اٹھا کر چلنے کی خواہش اور کسی حد تک منظم سعی کا نتیجہ ہندوستانیوں کے لیے مزید خستگی اور خرابی میں ظاہر ہوا۔ تاہم آزادی کے حصول کی خواہش چنگاری کی صورت دلوں میں دہک رہی تھی۔ علمی اور ذہنی بیداری کا جو عمل شروع ہوا اس نے مزید پچاس برسوں میں تحریکِ آزادی کی واضح شکل اختیار کی۔ یہ ملک کی سیاسی اور اصلاحی جماعتوں کی ملی جلی مساعی کا ثمرہ تھا۔ آزادی کے حصول میں گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ زبان اردو کا حصہ قابلِ قدر ہے۔ اس کے بیشتر گوشے آج بھی روشنی کے محتاج ہیں۔ تاہم جو کچھ مختلف وسیلوں اور ذرائع سے ہم تک پہونچا ہے وہ اس محترم زبان کو دلوں میں بسانے اور سر آنکھوں پر جگہ دلانے کے لیے کافی ہے۔

اس زبان نے تحریکِ آزادی میں جو رول بیسویں صدی کے آغاز سے ادا کیا وہ ہر اعتبار سے مثبت اور لائقِ ستائش ہے تاہم جو رول اردو اخبارات نے انیسویں صدی

کے کرب و انتشار والے زمانے میں براہ راست اور بالواسطہ انجام دیا اس کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ وہی آنے والے زمانہ میں اس کے کردار کی بنیاد بنا۔

ہمارے وسیع و عریض ملک میں عوام کے مختلف طبقوں کے مفادات کا تحفظ اور متصادم ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اور جب زندگی کا مقصد محض وقتی اور ذاتی اغراض کی تکمیل ہو تو ملکی قومی مفاد پس پشت جا پڑتا ہے۔ اس کی عملی شکل کو یوں متصور کر سکتے ہیں۔ انیسویں صدی میں ہندوستانیوں میں انگریز دوستی اور انگریز دشمنی کے رجحانات کہیں الگ الگ اور کہیں ملی جلی شکل میں نظر آئے ہیں۔ دراصل یہی رجحانات دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر دلوں اور ذہنوں اور ذہنوں میں اس بیداری کا باعث بنے جس کے نتیجے میں ہمیں آزادی ملی۔

میں بغیر کسی مزید تمہید کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ موضوع ہے "تحریک آزادی اور انیسویں صدی میں اردو اخبارات کا کردار"۔

اخبارات کے کردار پر اظہار خیال کرنے سے پہلے اردو صحافت کے مزاج کو سمجھ لینا مفید مطلب ثابت ہوگا۔ اردو اخبارات کے کردار اور مزاج کے تعلق سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اقتباسات عتیق صدیقی مرحوم، گارسان دتاسی اور ظ۔ انصاری کے ہیں۔ یہ ایک ہی لڑی کی مختلف کڑیاں ہیں۔

عتیق صدیقی مرحوم اپنی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں لکھتے ہیں :-

"۱۸۵۷ء کے اوائل کے ہندوستانی اخباروں میں عموماً اور اردو اخبارات میں خصوصاً انگریزوں اور ایرانیوں کی جنگ کی خبریں اس کثرت سے شائع ہوتی تھیں کہ جس کا کوئی حد و حساب نہ تھا۔ ان خبروں کا مواد اور ان کے پیش کرنے کا انداز اعلانیہ انتہائی انگریز دشمنانہ ہوتا تھا"

اسی کے پیش نظر انگریزی اخبارات اور ان اخبارات نے جن کے ایڈیٹر یا مالک انگریز تھے واویلا شروع کیا کہ اردو اخبارات نفرت پھیلا رہے ہیں اور عوام کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب بپا ہونے کے بعد ہندوستان

کے انگریز گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے بھی محسوس کیا کہ " دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے اور یہ کام بڑی مستعدی اور چالاکی سے انجام دیا گیا ہے "۔

نتیجے کے طور پر اخبارات پہ ایک بار پھر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ایسی پابندیاں اس سے پہلے ۱۸۲۳ء میں لگائی گئی تھیں۔ ان پابندیوں کے خلاف راجہ رام موہن رائے نے احتجاج کیا۔ انھوں نے پریس آرڈی نینس کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل دائر کی۔ پریوی کونسل نے ان کی یہ اپیل رد کر دی۔ احتجاجاً راجہ رام موہن رائے نے اپنا " مراۃ الاخبار " بند کر دیا۔ یہ فارسی زبان میں ملک میں شائع ہونے والا پہلا اخبار تھا۔ اس طرح ملک میں اخبارات کی آزادی کے لیے اٹھائی گئی یہ پہلی آواز تھی۔

جہاد آزادی میں ہندوستانی اخبارات کے کردار کے تعلق سے اب ایک بیان گارساں دتاسی کا ــــ

" ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخبارات نے جو بدمزگی پھیلانے میں پہلے سے ہی مستعدی دکھا رہے تھے اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہلِ ہند کو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پہ آمادہ کر دیا۔ اور یہ باور کرایا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں "۔

گویا اردو اخبارات نے ابتدا ہی سے اپنے لیے مشکل اور پر خطر راستے کا انتخاب کیا۔ فیض احمد فیض کا یہ شعر اس زمانہ کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے

اور اب ایک بیان ظ۔ انصاری کا ــــ

" مزاج اس زبان کا بہر حال سوداوی ہے اسے گرمی جلدی چڑھتی ہے اور موسم بھی گرم ہو (کسی سیاسی یا ہنگامی مسئلے پر) تو اس کے بدن سے پسینے

کے فوارے اور بھبکے چھوٹتے ہیں۔ چوں کہ صحافت میں صحافت کی نقل و حرکت کا عمل تیز ہے۔ فوری اثر ظاہر ہوتا ہے۔ الفاظ پے در پے بنتے بگڑتے اچھلتے کودتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں ایجی ٹیشنل عبارت آرائی پوری بیٹری خالی کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ گرم مزاجوں کو اس زبان کی صحافت راس آئی ہے۔ آتی ہی ہے۔ جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو کا منظر ہماری زبان کی صحافت میں الٹا چل رہا ہے۔ یہاں اخبار کے میدان کارزار میں توپ نکالی جاتی ہے۔"

جناب ظ۔ انصاری نے گویہ جملے "ہمدرد" کے مولانا محمد علی جوہر زمیندار کے مولانا ظفر علی خاں اور شورش کاشمیری کے تعلق سے کہے ہیں۔ تاہم مجموعی اعتبار سے یہ اردو کی تمام تر صحافت پر چسپاں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ صحافت بیسویں صدی کی ہو یا انیسویں صدی کی۔

انیسویں صدی میں اردو اخبارات جہاد آزادی کے کس طرح معین اور معاون بنے اس کا جائزہ ہمیں مختلف اوقات میں کار فرما حاوی رجحانات کی روشنی میں لینا ہوگا۔ اس غرض سے اردو اخبارات کو دو زمروں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا۔ اول وہ اخبارات جو انگریزوں نے ہندوستانی رائے عامہ کو اپنی موافقت میں ہموار کرنے کے لیے جاری کرائے یا جن کی بھرپور سرپرستی اور معاونت کی۔ ان اخبارات کا کردار مجہول رہا وہ انگریزوں اور بعد میں برطانوی حکومت کے حامی اور حمایتی تھے۔ وہ انگریز دوست تھے لیکن ان کا یہ رویہ بھی ہندوستانی مفاد کے اس اعتبار سے منافی نہ تھا کہ وہ بالواسطہ طور پر اپنی تحریروں کے باعث انگریزی دشمنی کے جذبات کو پروان چڑھانے کا باعث بنے مثلاً اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ ایک بیان کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے نکلوایا تھا۔ اس کے مالک ہری ہر دت اور ایڈیٹر لالہ سدا سکھ تھے۔ اس کا پرنٹر ایک انگریز ولیم ہوپ تھا۔ یہ اخبار کبھی اردو اور کبھی فارسی میں مشکلات اور مسائل کے باوجود نکلتا رہا۔ دراصل اس کے مسائل میں انصافہ وطن دوستی کے گہرے جذبے کے باعث ہوا کہ

اس نے پنجاب کی سکھ ریاست پر انگریزوں کے حملے کی تیاری کی خبر حملے سے بہت پہلے شائع کر دی تھی۔ اس سے ہندوستانیوں میں مزید بے چینی پھیلی تھی۔ اخبار معتوب ہوا اور بہ وجوہ بہ مشکل عمر کے چھ سال پورے کر پایا اور بند ہو گیا۔

انگریزوں نے مختلف اوقات میں جو اخبار نکلوائے یا جن کی سرپرستی کی ان میں لاہور کا اہم اخبار 'کوہ نور' سرفہرست آتا ہے۔ یہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو جاری ہوا۔ اس کے مالک ہرسکھ رائے تھے۔ یہ اخبار انگریزوں کا حامی تھا۔ حمایت بھی اس حد تک کہ پالیسی سے بیزار ہو کر ایک بیان کے مطابق ہرسکھ رائے نے اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اپنا علیحدہ و حریت پسند اخبار نکالا۔ اس اخبار نے انگریزوں کی اس شدت سے مخالفت کی کہ وہ گرفتار کر لیے گئے۔

ہرسکھ رائے کا ذکر ضمناً بیچ میں آ گیا۔ بات لاہور کے اخبار کوہ نور کی ہو رہی تھی۔ یہ اخبار ہندوستان کے مجاہدین آزادی کی پکڑ دھکڑ، ان کی املاک کی ضبطی اور مکانوں کے گرائے جانے نیز مقدمات اور دی گئی سزاؤں کی خبریں بڑی تفصیل سے شائع کیا کرتا تھا۔

اس اخبار کا یہ بظاہر مجہول رویہ بھی ان حالات میں یقیناً مثبت ثابت ہوا کہ اس نے ہندوستانی عوام میں انگریز دشمنی کے جذبے کو، جو چنگاری کی طرح سینوں میں دہک رہا تھا، ہوائیں دیں۔

۱۸۵۸ء میں منشی دیوان چند نے سیالکوٹ سے ریاض الاخبار شائع کرنا شروع کیا۔ منشی دیوان چند کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ منشی دیوان چند کا ذکر اس ضمن میں اس اعتبار سے بھی ضروری ہے کہ انھوں نے مختلف اوقات میں اردو کے متعدد ہفتہ وار اخبار نکالے جن میں 'چشمۂ فیض' 'خورشید عالم' 'ہمائے بے بہا' 'نور علی نور' 'وکٹوریہ پیپر' وغیرہ شامل ہیں۔

اس سلسلے میں پنجاب پنچ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ اخبار مولوی فخر الدین منچلی نے جاری کیا۔ یہ رومن رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ ایک اشاعت میں مولوی منچلی نے انگریزوں کی سرپرستی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا: "انہیں ایک

شریف، سخن پرور اور نہایت فیاض حاکم کی امداد حاصل ہے۔"

(قیاس ہے کہ ایسے اور اخبارات بھی ملک کے مختلف شہروں سے مختلف اوقات میں شایع ہوئے ہوں گے۔)

اب ہم دوسرے زمرے میں آنے والے اخبارات پر توجہ دیں گے جن کے مالکان اور مدیروں نے تحریک آزادی میں براہ راست معاونت کی۔ کھلے سخنے دامے درمے مدد کی۔

ایسے اخبارات میں سرفہرست دہلی کا دہلی اردو اخبار ہے۔ یہ اخبار مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۹ء میں جاری کیا تھا۔ مولوی محمد باقر اعلانیہ جنگ آزادی کی حمایت اور انگریزوں کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ مولوی محمد باقر ہی جنگ آزادی کے لیے شہید ہونے والے پہلے اردو صحافی تھے۔ ان پر یہ الزام بھی عائد ہوا کہ انھوں نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کی مدد نہیں کی۔ مولوی محمد باقر کو دہلی کے خونی دروازے کے باہر بعض دیگر عمائدین کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد حسین آزاد اس شہادت کے عینی شاہد تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنے والد کے دست راست تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۴ء میں دہلی اردو اخبار کی ادارت سنبھالی۔ ایک مرحلے میں وہ خود بھی جہاد آزادی میں پیش پیش تھے۔ حکام نے انھیں اشتہاری مفرور قرار دیا اور ان کی گرفتاری کے لیے پانچ سو روپے کا اعلان کیا تھا۔ مگر وہ بچ نکلے۔

دہلی ہی کے صادق الاخبار نے جنگ آزادی کی بھرپور حمایت اور انگریزوں کی شدت سے مخالفت کی۔ اس کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین تھے۔ یہی نہیں مولوی صاحب نے اخبار کے ذریعے انگریزوں کے قتل کی تلقین کی۔ اپنے وطن دوستانہ رویوں کے باعث ہی وہ انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ تین سال قید کی سزا دی گئی۔ ان کی جائداد بھی ضبط کر لی گئی۔

اس ضمن میں کلکتہ کے اخبار گلشن نو بہار کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ اخبار گو فارسی کا تھا مگر اس میں اردو میں بھی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے ایڈیٹر عبدالقادر نے پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اخبار میں باغیانہ مضمون شائع کیے۔ نواب

اودھ کی برطرفی اور سزائے قید نیز اودھ کو انگریزوں کی عمل داری میں شامل کیے جانے پر کڑی نکتہ چینی کی۔ انگریزوں نے ان کی آواز کو دبانے کی غرض سے اخبار بند کر دیا اور چھاپہ خانہ ضبط کر لیا۔

اودھ اخبار ۱۸۵۹ء میں منشی نول کشور نے شروع کیا۔ جنگ آزادی میں گو اس اخبار نے راست کردار ادا نہیں کیا۔ لیکن یہ خبروں کی حد تک انگریزوں سے کوئی رو رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس نے انگریزی حکومت کی بد انتظامیوں پر نکتہ چینی کی۔ ہندوستانی حکمرانوں کی عیاشیوں اور فضول خرچیوں پر اعتراضات کیے۔ اور اس طرح سیاسی بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔

اودھ اخبار نے انگریزی اخباروں کو ہندوستان کی آستین کا سانپ قرار دیا۔ اندور کی جنگ آزادی کے مجاہد سعادت خاں، پونا کے مجاہد رام پرشاد، رامپور کے باغی نیاز احمد اور وہابی تحریک کے رہنما امیر خاں کی گرفتاری، ان کے خلاف چلائے گئے بغاوت کے مقدمے کی کارروائی اور پھانسی کی سزا کی خبریں تفصیل کے ساتھ شائع کیں۔ گویا یہ بالواسطہ جہاد آزادی کا معاون بنا۔

ماہنامہ تاریخ بغاوت ہند، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایک انقلابی اخبار تھا۔ یہ آگرہ سے جولائی ۱۸۵۹ء میں ڈاکٹر مکند لال نے جاری کیا اسے جنگ آزادی کی تفصیلات کا مخزن کہنا بجا ہوگا۔ اپنے مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارے میں ڈاکٹر مکند لال نے کانپور کی جنگ آزادی کے مفصل حالات شائع کیے۔ اسی رسالے میں جنگِ آزادی کے لیے نانا صاحب کا تاریخی اعلان اشتہار کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ یاد رہے کہ نانا صاحب نے کانپور میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔

اس رسالے نے وقت اور قوم کی خدمت یوں بھی انجام دی کہ یہ فرقہ وارانہ اتحاد کا زبردست علمبردار تھا۔

۱۸۹۰ء میں منشی ایودھیا پرشاد نے اجمیر سے خیر خواہ خلق جاری کیا۔ جب تک یہ اخبار شائع ہوا، انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈہ کرتا رہا۔ ہندوستانیوں کے

اسلحہ سے محروم کیے جانے پر اس نے زبردست احتجاج کیا۔ انگریز مشنریوں کی طرف تبدیلیٔ مذہب کے خلاف اقدامات کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایسی پرجوش تحریروں کے لیے منشی ایودھیا پرشاد معتوب ہوئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ قید کی سزا ہوئی اور یہ اخبار حکمتاً بند کر دیا گیا۔

جلوۂ طور میرٹھ سے ۱۸۹۱ء میں رائے گنیش لال نے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر سید ظہیر الدین طور تھے۔ طورؔ صحافی ہی نہیں انقلابی بھی تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ملازم رہے تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ رائے گنیش لال کے والد بھی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں گولی سے اڑا دیئے گئے تھے.... جس اخبار کا مالک اور مدیر دونوں انگریزوں کے ہاتھوں زخم خوردہ ہوں۔ اس اخبار کی پالیسی کیسی ہو سکتی ہے ؟ اس کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں۔

۱۸۷۰ء میں انجمن پنجاب، پیرزادہ محمد حسین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ خبروں کی حد تک تبصرے کے ساتھ انگریزوں کی دراز دستیوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بے نقاب کیا کرتا تھا۔

"پنجابی اخبار" ۱۸۵۹ء میں لاہور سے نکلا۔ یہ اخبار ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔ یہ اخبار بڑا تعمیری مطمحِ نظر کا حامل تھا۔ فرقہ وارانہ اتحاد اس کا نصب العین تھا۔ حکومت کی پالیسیوں پر اکثر نکتہ چینی کرتا تھا۔

۱۸۸۱ء میں مولوی محروم علی چشتی نے لاہور سے ہفت روزہ "رفیق ہند" جاری کیا۔ یہ آزاد اخبار تھا۔ سرکاری حکام کی زیادتیوں اور عدالتوں کے غیر منصفانہ فیصلوں کی نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔

"منشور محمدی"۔ یہ اخبار منشی محمد شریف نے ۱۸۷۲ء میں بنگلور سے جاری کیا۔ یہ اخبار بڑی مستعدی سے انگریز مشنریوں کی پول کھولتا اور جہاد آزادی کی پرزور حمایت کیا کرتا تھا۔ یہ ہندوستان کے باہر مصر اور دوسرے ملکوں میں بروئے کار لائے گئے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کیا کرتا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی اقتصادی

لوٹ کو ملامت کا نشانہ بنایا۔ اس اخبار کے خیال کے مطابق انگریز حکومت چنگیز خاں تیمور اور نادر شاہ سے بھی زیادہ غاصب تھی۔

منشور محمدی نے اپنے ۱۳ر نومبر ۱۸۸۵ء کے شمارے میں انگریزوں کی شکست پر خوشی کا اظہار کیا۔ مصر میں مہدی نے جب انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو اخبار نے مہدی کی تعریف کی۔ اور اس اعلان جنگ کا اشتہار بھی چھاپا۔

نجم خانہ ہند۔ مولوی احمد حسن شوکت نے ۱۸۸۳ء میں میرٹھ سے جاری کیا۔ یہ مسلمانوں کو ہندوستان کے بڑے قومی دھارے میں شمولیت کی دعوت دیتا رہا۔ اور سرسید کے جوابی مضمون لکھتا اور شائع کرتا۔ اپنی یکم جون ۱۸۸۸ء کی اشاعت میں اس نے سرسید پر یہ الزام لگایا کہ" کانگریس انشائی حلقوں کے جو مطالبات پیش کرتی ہے سید شاہی پارٹی کہتی ہے کہ اس میں بغاوت کا مادہ ہے۔ یہ پارٹی اپنے آپ کو حکومت کا وفادار ظاہر کرتی ہے اور الزام لگاتی ہے کہ اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو گئے تو باغی ہو جائیں گے۔

پیسہ اخبار۔ منشی محبوب عالم نے ۱۸۸۷ء میں لاہور سے جاری کیا اسے قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ منشی محبوب عالم نے کھل کر تحریک آزادی کی حمایت کی۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تلقین کی انگریزوں پر اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا الزام لگایا۔

ایک بیان کے مطابق ۱۸۲۲ء سے ۱۸۹۹ء تک ملک کے مختلف مقامات سے پانچ سو اخبار و رسائل جاری ہوئے اس مقالے میں ظاہر ہے سب کے ذکر کی گنجائش نکالنا محال ہے محض نمائندہ اخبارات کا اجمالی ذکر کیا گیا۔

اس مرحلے پر ان اردو اخبارات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان سے باہر غیر ملکوں میں ہندوستان کے مفاد کی ترجمانی کی۔ وہاں کے عوام کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور دراز دستیوں سے روشناس کرایا اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کے حق میں فضا کو سازگار بنانے کی کوشش کی۔ ان اخبارات

میں پندرہ روزہ "ترجمان شوق" سرفہرست آتا ہے۔ یہ اخبار اردو اور عربی میں سکندر آفندی نے ۲۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو قسطنطنیہ سے جاری کیا تھا۔ سکندر آفندی دو برس ہندوستان میں رہے تھے اور بیشتر وقت لکھنؤ اور دہلی میں گزارا تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں حالات و کوائف اہل دہلی اور اہلِ لکھنؤ سے حاصل کیے تھے۔ تباہی اور خرابی کے آثار لکھنؤ اور دہلی کے گلی کوچوں میں دیکھے تھے۔ سکندر آفندی نے یہ حالات۔ بڑے موثر انداز میں بالاقساط اخبار میں شائع کیے۔ ان کا اخبار متعدد اسلامی ملکوں میں شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس اخبار کی مقبولیت سے انگریز حکومت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی وہ اپنے رسوخ کو بروئے کار لائی اور یہ اخبار ۱۸۸۰ء میں بند کرا دیا گیا۔

منشی قادر بخش نے ترکی سے ہفتہ وار اخبار 'سلطان الاخبار' کے نام سے یکم جنوری ۱۸۸۰ء کو جاری کیا۔ منشی جی فارسی و عربی کے بڑے عالم تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بددل ہو کر ترکی چلے گئے تھے۔ تاہم دہلی کی تباہی و بربادی کے نقش ان کے ذہن میں تازہ تھے۔ اپنے اخبار میں انگریزوں کی قتل و غارت گری کا ذکر ضرور کرتے۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت اور جہاد کی ترغیب دیتے۔

اسی طرح ایک رسالہ "ہندوستان" پرتاپ گڑھ کے آنریری مجسٹریٹ راجہ رائے سنگھ نے اگست ۱۸۸۴ء میں لندن سے جاری کیا۔ اردو ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا یہ رسالہ ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کیا کرتا تھا۔ اس کا ایک مقصد انگلستان کے انگریزوں کو ان مظالم سے آگاہ کرنا بھی تھا جو ان کے ہم وطنوں نے ہندوستانیوں پر ۱۸۵۷ء میں توڑے تھے۔ انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ حقارت آمیز سلوک اور تجارتی استحصال بھی اس رسالہ کے خاص موضوعات ہوتے تھے۔

بقول مولانا امداد صابری" انگریزوں کی غلامی کے بعد ہی سے انگریزوں کے خلاف ہر ہندوستانی کے دل میں نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا چنانچہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک ہندو مسلمان انقلابی اگرچہ علیحدہ علیحدہ صفحوں پر نظر

آتے تھے، لیکن مقاصد اور خیالات میں ایک تھے "۔

ان کے علاوہ چین، جاپان، امریکہ، انگلستان، فرانس، کنیڈا وغیرہ ملکوں سے مختلف وقتوں میں متعدد اخبار جاری ہوئے۔ ان میں چین سے نکلنے والے رسالہ "العین" لندن کے اخبار "انڈین سوشلسٹ" آرک لینڈ امریکہ کے سرکلر آزادی مولانا برکت اللہ بھوپالی کا ٹوکیو سے شائع ہونے والا اخبار "اسلامک فریٹرنٹی" کنیڈا سے جاری ہونے والا انقلابی اخبار "ہندوئی" مولانا برکت اللہ بھوپالی اور رام چندر کا کیلی فورنیا کے ایک شہر سیکرامین ٹو سے جاری کردہ ہفتہ وار اخبار 'غدر' اور متعدد دیگر اخبارات خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔ بقول مولانا امداد صابری "اس وقت کا کوئی انقلابی رسالہ اور اخبار ایسا نہیں ہوتا تھا، جس میں اردو کا حصہ نہ ہوتا ہو۔ ان مذکورہ اخبارات کی تفصیل میرے موضوع کے دائرے میں نہیں آتی کہ یہ سبھی بیسویں صدی میں جاری ہوئے تھے

ان کے ساتھ ہی سر سید احمد خاں کے رسائل "سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۹۹ء) — تہذیب الاخلاق اور ماسٹر رام چندر کا محب ہند جیسے رسائل توجہ چاہتے ہیں۔ گو ان رسائل نے تحریک آزادی میں براہ راست معاونت نہیں کی تاہم جدید علوم اور فنون پر پر مضمون شائع کرکے بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کی۔ مولانا حالی کے الفاظ میں "کم سے کم شمالی ہند میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس یعنی سائنٹفک سوسائٹی کے اجرا سے شروع ہوتی ہے "۔

میں نے اپنے اس مقالے میں کوشش کی ہے کہ مقالہ محض ناموں اور سنین کی کھتونی نہ بننے پائے اور انیسویں صدی میں تحریک آزادی کے تعلق سے ہندوستان اور غیر ممالک میں بروئے کار آنے والی اردو مساعی کا موثر احاطہ ہو جائے۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ کوئی اہم نام یا کام احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ گیا ہو۔ اگر آپ دوست اس کی نشاندہی فرمائیں گے تو مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی

اور

اردو صحافت

کامریڈ راجندر

آزادی کی جدوجہد میں اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق حصّہ لینے کا فخر و افتخار مجھے بھی حاصل ہے۔ اگرچہ اس عظیم تحریک میں میرا مقام سمندر میں ایک چھوٹے سے قطرے سے بھی کم تھا تاہم میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی میں نے اردو اخبارات اور جرائد سے ہی وطن کی محبت اور آزادی سے پیار کا درس لیا تھا۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میدانِ صحافت میں بھی میں نے ایک اردو اخبار کے ایک مبتدی رکن کی حیثیت سے ہی قدم رکھا تھا اور جیسے ہی میں نے ۴۵ برس ہوئے ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ سے ڈپلوما اِن جرنلزم کا امتحان دیا، مجھے مہاتما گاندھی کے قدموں میں اردو صحافت کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جبکہ میں نے سیواگرام آشرم میں اردو ہری جن کی ادارت کے فرائض سنبھال لیے۔ باپو کے انگریزی میں لکھے مضامین کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو ہری جن کو ترتیب دینا میرا کام تھا اور یہ کام مجھے مہادیو ڈیسائی کی زیر نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ جس زمانے میں مَیں نے سکولی تعلیم حاصل کی تو اردو ہی چلتی تھی کیونکہ میرا بچپن وطنِ عزیز کے اُس خطہ میں گزرا تھا جسے اب پاکستان کہتے ہیں۔

وہاں سارے کام اردو ہی میں ہوتے تھے اور میرے جیسے سیاسی کارکنوں کی تقریر و تحریر کا ذریعہ بھی اردو زبان ہی تھی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو صحافت کے موضوع پر بحث کا آغاز کرتے سے پہلے میں ایک گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس مقالہ میں مَیں نے اپنی توجہ صرف اردو صحافت پر ہی مرکوز کی ہے۔ اس کا مطلب ہندوستان کی دوسری زبانوں ہندی، پنجابی، تامل یا تیلگو وغیرہ کی واضح اہمیت کو کسی بھی صورت میں نظر انداز کرنا یا انھیں ثانوی حیثیت دینا مقصود نہیں۔ ہمارے آئین میں جن زبانوں کو جگہ دی گئی ہے وہ سب ہمارا مشترکہ قومی سرمایہ ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان تمام زبانوں نے یکساں طور پر مادر وطن کو بدیشی سامراج کی آہنی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے اپنا اپنا فرض پورا کیا ہے۔ تاہم اردو کے متعلق قابل غور خاص بات یہ ہے کہ یہ زبان ہماری راشٹر بھاشا ہندی کا ہی دوسرا روپ ہے، جو کہ ہندی کی طرح ہی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فرق رسم الخط یا لپی کا ہے۔ اردو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندی دیوناگری میں۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی کشمیر سے لیکر کنیا کماری اور کاٹھیا واڑ سے کامروپ تک ہمارے کروڑوں ہموطن بھائیوں کے جذبات، عقائد، امیدوں اور امنگوں کی ترجمانی کرتی ہے اس لیے ہندی کہیے یا ہندوستانی یا اردو۔ دراصل یہ زبان ایک ہی ہے اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آزادی کا پرچم اٹھائے اردو صحافیوں نے ان گنت مشکلات کا سامنا کیا اور مصیبتیں برداشت کیں، لیکن اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ ہندی کے اخبار نویس بھی اسی راہ کے راہی رہے ہیں۔ اس لیے ہم اردو صحافت کے معماروں اور اکابرین کو جب اپنا سلام بھیجتے ہیں تو یکساں طور پر ان تمام دیش بھگت جرنلسٹوں اور قلم کے سپاہیوں کے تئیں بھی اظہار تشکر کرتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے مورچے پر قلم کی لڑائی جاری رکھی اور تب تک جاری رکھی جب تک انھوں نے منزلِ مقصود کو پالیا یا لڑتے لڑتے وہ گر نہیں گئے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں اردو صحافت نے ایثار و قربانی اور عقیدہ و اعتقام

پر ثابت قدمی کی وہ بلندیاں حاصل کی تھیں جن کی مثال ہندوستان یا ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک کی انقلابی تحریکوں میں بھی ملنی محال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زار شاہی کے زمانہ میں روس کے دو انقلابی اخباروں پراودا PRAVDA اور اسکرا ISKRA کو زندہ رکھنے کے لیے لینن اور ٹراٹسکی اور اُن کے سینکڑوں ساتھیوں نے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ اردو صحافت میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک ایک ایڈیٹوریل کے لیے جسے حاکمانِ وقت نے باغیانہ قرار دیا، اخبار کے مالک یا ایڈیٹر کو سزائے موت کا سامنا کرنا پڑا یا زندگی بھر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے انڈیمان کی دوزخی جیل میں جھونک دیا گیا۔ قابلِ صد افسوس بات تو یہ ہے کہ ہم اتنے احسان فراموش ثابت ہوئے ہیں کہ ان کے نام تک بھول گئے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ بہت سی باتیں پرانی ہو جاتی ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم انگریزی راج سے نجات حاصل کرکے بھی انگریزیت سے آزاد نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ میکالے MACAULAY کے بنائے ہوئے تعلیمی نظام کے ذہنی غلام، خود ساختہ دانشور طبقہ کی نگاہ میں اردو زبان یا اردو صحافت یا ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی صحافت کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ لوگ جو آج ایڈمنسٹریشن پر چھائے ہوئے ہیں، یا قومی زندگی کے تمام شعبوں میں تمام طاقت اور اقتدار پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں انگریزی اور صرف انگریزی جانتے ہیں اور اسی کے ذریعے اپنی روٹی کماتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان میں چھپنے والے اخبار ہی "پریس" کہلاتے ہیں اور رائے عامہ کی نمائندگی کرنا صرف اُن ہی کی اجارہ داری ہے۔ کیا یہ دوست ہیں کہ ہماری زبانوں کو VARNACULAR کہتے ہیں۔ VERNACULAR کا مطلب ہوتا ہے غلام لوگوں کی بولیاں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے احکام ہماری زبانوں کو جو سنسکرت یا تامل یا بنگالی کی طرح علم و ادب سے مالامال ہیں۔ VERNACULARS ہی کہتے تھے کیونکہ بدیشی حاکم ہندوستان کے لوگوں کو غلام کہتے تھے اور یہاں کے کلچر اور تہذیب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لیے انھوں نے وہی وطیرہ اختیار کیا جو رومن فاتحوں کا اپنے غلاموں یعنی مفتوحہ نوآبادیوں

کے عوام کی طرف ہوتا تھا۔ یہ لفظ رومن لوگوں کا ہی تحفہ ہے۔ رومن قوم اپنی کالونیوں کے باشندوں کو حقیر اور ادنےٰ قسم کے انسان سمجھتے تھے۔

اس مضمون کا دائرہ بہت وسیع اور عمیق ہے اور آپ صاحبان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔ لہٰذا میں تو چند ایک اہم نقطوں کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔ بلاشُبہ اس میدان میں تحقیق و مطالعے کی بہت بڑی گنجائش ہے، جس کے بغیر یہ بیان کئی باتوں میں تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میری گذارشات کچھ نشان دہی تو کریں گی ہی جن سے اس مسئلہ پر مزید چھان بین اور غور و خوض میں محققین کو مدد ملے گی۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان میں ایک ایسا ہفتہ وار اخبار بھی تھا، جس کا ذکر تک صحافت کی تاریخ کی درسی کتابوں میں نہیں ملتا کیونکہ انگریزوں کو اس کا نام تک سننا بھی گوارہ نہیں تھا، لیکن جس کو ساری دنیا میں یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ صرف اڑھائی برس کی قلیل مدت میں یکے بعد دیگرے ۸ مدیروں کو باغیانہ اداریے یا نظمیں شائع کرنے کے جرم کی پاداش میں حبس دوام کے لیے کالے پانی کی زنداں میں ٹھونس دیا گیا۔ دو ایڈیٹروں لدھا رام کپور اور نند گوپال کو تیس تیس سال کی قید بامشقت، باجو رام کو اکیس سال اور ہوتی رام ورما کو دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

اس اخبار کے سب سے پہلے ایڈیٹر مہاتما شانتی نارائن تھے جو ۲½ سال قید بامشقت کی سزا پا کر جیل میں بند رہے۔ اس اخبار کا نام "سوراجیہ" تھا اور اسے لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کی آشیرواد سے ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے پنجابی انقلاب پسندوں نے شائع کیا تھا۔

لاہور میں لالہ لاجپت رائے اور شہید اعظم سردار بھگت سنگھ کے چچا سردار اجیت سنگھ جنھوں نے اپنی ساری زندگی حصول آزادی کے لیے وقف کر دی تھی، قومی پرچار کے لیے بھارت ماتا سوسائٹی نام کی ایک جماعت قائم کی جس کے ایک ممبر کا نام مہاتما شانتی نارائن تھا۔ آپ کو امرت بازار پتریکا کے ممتاز ایڈیٹر بابو موتی لال گھوش

نے صلاح دی کہ اردو زبان میں انقلابی تحریک کے پرچار کو فروغ دینے کے لیے ایک رسالہ شروع کیا جائے ۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے جس سال دیش بھر میں اور غیر ممالک میں بھی انقلاب پسند ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کی یاد منانے کی خفیہ تیاریاں کر رہے تھے ۔ الہ آباد کا شہر اس لیے چُنا گیا ۔ کیونکہ اُتر دیش (اُس زمانے میں اسے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کہا جاتا تھا) میں ہی ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے زیادہ سے زیادہ طاقت پکڑی تھی ۔

مہاتما شانتی نارائن کو اپنے پیغام میں بابو موتی لال گھوش نے یہ مشورہ دیا تھا ۔ "اگر آپ "سوراجیہ" کو انقلابی راستے پر چلانا چاہتے ہیں تو آپ کا اپنا ایک قدم جیل کی طرف اُٹھا رکھنا ہوگا ۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے کسی رفیقِ کار کو بھی تیار رکھنا ہوگا تاکہ وہ آپ کی جگہ لے سکے ۔

بنگال کے ایک انقلابی نوجوان خودی رام بوس کو جب تختۂ دار پر جامِ شہادت نوش کرایا گیا تو مہاتما شانتی نارائن نے اس موقعہ پر ایک جوشیلی نظم شائع کی اور اس جرم میں آپ کو ساڑھے تین سال قید سخت کا حکم سنایا گیا ۔ اس زمانے میں جیلوں میں دیش بھگتوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا تھا کیونکہ انگریزی حکاّم کا رویّہ حد سے زیادہ منتقمانہ ہوتا تھا ۔

مہاتما شانتی نارائن کی سزایابی کے بعد لدھا رام کپور نے سوراجیہ کا قلمدانِ ادارت سنبھالا ۔ آپ نے اپنے اخبار میں ایک نرالی ہی قسم کا اشتہار شائع کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سوراجیہ کے لیے ایسے ایڈیٹروں کی ضرورت ہے جو محنتانہ یا معاوضہ کی صورت میں عمر بھر کے لیے جیل کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور زندگی بھر دو سوکھی روٹی اور دو گھونٹ پانی پر ہی قناعت کرنے کو تیار ہوں ۔" لدھا رام کپور کو جو سزائے قید دی گئی وہ وحشیانہ حد تک طویل تھی یعنی دس یا بیس سال نہیں بلکہ پورے تیس سال تھی ۔

لدھا رام کپور کے بعد بابو رام ہری نے "سوراجیہ" کا چارج لیا ۔ آپ نے ۱۸۵۷ء

کے واقعات پر ایک شعلہ بار نظم اِس رسالہ کے کالموں میں شائع کی۔ آپ کو اکیس سال قید بامشقت کی سزا کاٹنی پڑی۔ یاد رہے کہ ان ایڈیٹروں کو اپنی سزائیں بھگتنے کے لیے انڈیمان جیل کی کاٹھریوں میں جھونک دیا گیا۔

اس وقت انگریز حکمران حیران رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ لدھارام کپور کے اشتہار کے جواب میں بہت سے دیش بھگتوں نے سوراجیہ اخبار کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان میں پنڈت رام چندر بھاردواج بھی تھے جو پشاور کے رہنے والے تھے۔ آپ نے بعد میں امریکہ پہنچ کر ہندوستانی دیش بھگتوں کی انقلابی تنظیم غدر پارٹی کی سرگرمیوں میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ دوسرا قابلِ ذکر نام اس ضمن میں لالہ خوشحال چند جی کا تھا جنھوں نے لاہور سے "ملاپ" اخبار شائع کیا۔ جو آجکل جالندھر اور دلّی سے نکل رہا ہے۔ بعد میں لالہ خوشحال چند نے سنیاس آشرم میں داخل ہوکر" اپنا نام آنند سوامی سرسوتی رکھ لیا۔ لالہ خوشحال چند اور اُن کے "ملاپ پریوار" نے آزادیِ وطن کی خاطر جو قربانیاں کی ہیں ان کی داستان بہت لمبی ہے۔ لالہ جی کے بیٹوں شری رنبیر، یش اور یُدھویر نے انقلابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ اور اردو صحافت کے ذریعہ بھی وطن عزیز کی خدمت کی۔ شری رنبیر کو تو پھانسی کی سزا بھی ہوئی لیکن آپ ہائیکورٹ سے بری ہو گئے۔ یہاں تو سلسلہ سوراجیہ اخبار کا چل رہا تھا۔ انگریزی سرکار کے لیے سوراجیہ اخبار کا وجود ہی ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور آخر کار ایک خاص حکم کے تحت اس اخبار کے دفتر کو سربمہر کر دیا گیا اور اس کے تمام اثاثے اور ذرائع بحق سرکار ضبط کر لیے گئے۔

جملہ معترضہ کے طور پر میں یہ بھی عرض کر دوں تو بعید از مضمون نہیں ہوگا کہ دورِ حاضر کی صحافت اور صحافیوں کے کردار یا کارکردگیوں کا مقابلہ اگر ہم اردو صحافت کے جنگ آزادی کے زمانے کے مجاہد صحافیوں سے کریں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جرنلزم اب ایک مقدس مشن نہیں رہا بلکہ دیگر پیشوں کی طرح دولت کمانے اور اقتدار حاصل کرنے کا محض ایک ذریعہ ہی بنا لیا گیا ہے۔ یہ بھی میں مانتا ہوں کہ ہاتھ کی

انگلیاں بھی برابر نہیں ہوتی ہیں اس لیے جرنلسٹوں میں کچھ اصول پرست لوگ اب بھی مل جاتے ہیں لیکن اسے استثناء ہی کہیں گے آج کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اخبار نویس اکثر پلاٹوں، کاروں یا دوسرے ذرائع سے مالا مال ہونے کی کوشش میں ایمان فروشی تک کی قیمت ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ سرکار ہو یا کوئی سیاسی پارٹی یا کوئی سرمایہ دار غرضمند صحافیوں کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں، وہ تو جہاں سے ہو فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں — صحافت میں پیشہ ورانہ اخلاق کا آجکل یہ حال ہے کہ چھوٹی موٹی خبر یا معمولی سا بیان بھی نامہ نگاروں کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا جب تک انہیں مئے، مرغ و ماہی نہ پیش کیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ وجہ کیا تھی کہ انگریزی سرکار، اردو یا دیگر ہندوستانی زبانوں کی صحافت سے اس قدر خائف تھی اور دشمنی کی حد تک اس کی مخالفت پر اتری ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ آزادی کی تحریک میں اردو صحافت عوام کے ہاتھ میں، برٹش سرکار کے خلاف ایک زبردست حربہ ثابت ہو رہی تھی۔ ویسے تو بنیادی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار کسی بھی صورت میں ہندوستان میں کوئی بیدار اور سرگرم رائے عامہ ابھرتی دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ کمپنی کے حاکموں کے شروع شروع میں جن کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا وہ اکثر انگریز جرنلسٹ تھے اور ان کے اخبار انگریزی زبان میں چھپتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا کمپنی سرکار نے انگریزی میں شائع ہونے والے اخباروں اور ان کے انگریز ایڈیٹروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنانے شروع کیے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ اخبار کمپنی کے متعلق اچھی اچھی باتیں لکھیں تاکہ برٹش پارلیمنٹ میں کمپنی کی ساکھ بنی رہے۔ انگریز جرنلسٹوں کے ساتھ انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانیوں نے بھی کام شروع کر دیا تھا اور یہ لوگ حکومت سے وفاداری کو اپنے ایمان کا جزو مانتے تھے۔ ان اخباروں کے نمائندوں اور نامہ نگاروں کو حکومت تمام سہولتیں دیتی تھی۔ اشتہارات اور دوسری نوازشوں کی اُن پر بارش ہوتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اُن پر جو قانون لاگو ہوتے تھے وہ بھی ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے مقابلہ میں بہت نرم ہوتے تھے

اگر انگریزی اخبار حکومت کی کہیں تھوڑی بہت نکتہ چینی کر بھی دیتے تو وہ کمپنی سرکار کو ناگوار نہیں گزرتی تھی۔ پھر حکومت سے ان کی اس نوک جھونک کو عام لوگ عاشق اور معشوق کی لڑائی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کمپنی سرکار یہ جانتی تھی کہ انگریزی اخباروں کا اثر عوام پر صفر کے برابر ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان پڑھنے یا سمجھنے والوں کی تعداد سارے ملک کی آبادی میں اگر آجکل صرف دو فیصدی ہے تو اس زمانے میں لازماً اس سے بہت کم تھی۔ ہم اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کچھ انگریزی اخبار ایسے بھی تھے جنھوں نے عوام کی آواز کے ساتھ آواز ملائی۔ مثلاً مدراس کا 'ہندو اخبار' یا کلکتہ کا "امرت بازار پتریکا' یا لاہور کا ٹربیون۔ لیکن ان اخباروں کا اثر عوام پر الٹا سیدھا اور صاف نہیں ہوتا تھا۔ کبھی ایسی بات نہیں ہوئی کہ ان اخباروں میں کوئی ایسی نظم یا مضمون چھپا ہو جسے پڑھ کر عوام بھڑک اٹھیں اور سڑکوں اور بازاروں کو میدانِ کارزار میں بدل دیں۔ اس کے برعکس اردو اخباروں کی تحریروں میں اتنی طاقت تھی کہ ایک موقعہ پر ایک انقلابی اخبار کے ہاکر کو بھی پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ کیونکہ وہ بازار کے چوک میں کھڑا ہو کر مجمع لگا کر اخبار بیچتا تھا اور اخبار میں چھپے مضامین یا نظمیں لوگوں کو سنایا کرتا تھا

ایک انگریز پادری جے لانگ J. LONG صاحب نے ۱۸۵۵ء میں کہا تھا۔

ہندوستانی اخباروں کی ظاہری شکل حقیر سی ہوتی ہے لیکن قومی گیتوں کی طرح وہ ہر اس موقعہ پر کامیاب ہوتے ہیں جہاں انگریزی اخبار ناکام رہتے ہیں اور طوفان میں بہتے ہوئے تنکوں کی طرح وہ بہاؤ کے رُخ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انگریزی مطبوعات کے مقابلہ میں دیسی اخباروں کی اشاعت کم ہوتی ہے، لیکن ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہوتا ہے۔"

ان حالات کے لیے انگریزی سرکار ذمہ دار تھی کیونکہ اسکا وطیرہ دیسی زبانوں کے اخباروں سے دشمنی کا تھا ویسے بھی جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں انگریزی حکومت شروع سے ہی نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان میں اخبارات جاری ہوں اور اس کی یہ بری نیت

آخر تک قائم رہی - اس کے علاوہ ایک انگریز حاکم تھامس منرو نے ۱۸۲۲ء میں جو لکھا اس سے تو انگریز حاکموں کے سوچنے کا ڈھنگ اور بھی صاف اور عیاری دکھائی دیتا ہے۔ تھامس منرو نے کہا۔ "ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں انہی کی رُو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ کبھی دی گئی ہے اور نہ کبھی دی جائے گی"۔ اگر ساری رعایا ہماری ہموطن ہوتی تو میں اخباروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی سفارش کرتا۔ لیکن چونکہ وہ ہماری ہموطن نہیں اس لیے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی بات نہیں ہوسکتی - اخباروں کی آزادی اور بدیشی حکومت ایسی متضاد باتیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتی ۔اور مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں"۔ انگریزی حکومت کو پریس سے اس قدر خوف تھا کہ ایک بار نظام حیدر آباد دکن کو کسی نے ایک چھپائی مشین یا مکمل چھاپہ خانہ بطور تحفہ پیش کیا۔ نظام نے اس میں بڑی دلچسپی دکھائی اور خواہش ظاہر کی کہ ان کی ریاست میں بھی کتابیں چھپیں اور اخبارات شائع کیے جائیں۔ اس پر انگریزی سرکار نے خفیہ کارروائی کر کے اس چھاپہ خانہ کو نظام کے توشہ خانہ سے اٹھوا دیا اور بعد میں تلف ہی کروا دیا۔ اِن حالات میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اولاً اردو صحافت کو ان تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کا شکار ہونا پڑا جو بالعموم تمام انگریزی اور ہندوستانی پریس پر تھیں۔ اس کے علاوہ ثانیاً اردو صحافت کو خاص طور پر ان تمام سہولتوں اور رعائتوں سے محروم رکھا گیا جو انگریزی اخباروں کو ملتی تھیں۔

انگریزوں کے زمانے میں ہندوستانی اخباروں پر سخت سے سخت قانون عائد ہوتے تھے۔ اخبار شروع کرنے پر بھاری ضمانتیں داخل کرنی پڑتی تھیں اور چونکہ حاکمانِ وقت کو ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی اردو اخبارات اپنے زبردست مضامین سے دھماکہ پیدا کر سکتے ہیں اس لیے اردو صحافیوں کے سروں پر بزدلوں جرمانوں قید و بند نظر بندیوں اور شہر بدر ہونے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں فرنگی کی زنداں کے دروازے تو حریت پسند صحافیوں کے لیے کھلے رہتے ہی تھے' دار و رسن بھی منتظر رہتے تھے وطن کے شیدائیوں کے لیے یہ کوئی مبالغہ کی بات نہیں' یہ ایک حقیقت

ہے کہ غدر اخبار کے ایڈیٹر سردار کرتار سنگھ سرابھا کو عالم شباب میں ہی جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

ہے خون جو شہید کا
وہ قوم کی زکات ہے
ہے موت جو شہید کی
وہ قوم کی حیات ہے

"غدر" اخبار امریکہ سے ہندوستانی انقلابیوں کی جماعت ہندوستان غدر پارٹی نے شروع کیا تھا۔ مشہور دیش بھگتوں جن میں لالہ ہردیال، بھائی پرمانند، بابا سوہن سنگھ بھکنہ کے نام قابلِ ذکر ہیں، انھوں نے اس اخبار میں لکھنے اور خفیہ طور پر اسکی ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں تقسیم کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اردو کے علاوہ غدر اخبار بہت سی دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی چھپتا تھا۔

اردو صحافت کی تاریخ ہندوستانی اخبار نویسی (جس میں انگریزی اور ہندوستانی اخباروں کا جز لازم شامل ہے) کی سرگزشت سے بنیادی طور پر جدا ہیں۔ گجراتی۔ بنگالی۔ ہندی اخباروں کا سلسلہ بھی ۱۹ ویں صدی کی تیسری یا چوتھی دہائی میں شروع ہوا تھا اردو کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا۔ جو اسی نام کے فارسی اخبار کے ایک ضمیمہ کی صورت میں ۱۸۲۲ء میں شروع ہوا۔ تب سے لیکر حصولِ آزادی یعنی ۱۹۴۷ء تک ——— ہندوستانی اخبار نویسی نے کئی مدّوجزر اور تغیّر و تبدّل دیکھے ہیں اور اردو صحافت کے سفر نے بھی نشیب و فراز کے کئی دور دیکھے ہیں۔ تاہم ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اردو اخباروں میں سے اگر بعض خاص خاص اخباروں نے وقتی مصلحتوں کا شکار ہو کر اگر قومی جدوجہد سے سرگرم وابستگی سے کنارہ کشی بھی اختیار کی ہو سکتی کُلی طور پر ان کی ہمدردیاں ہندوستانی عوام کی امیدوں اور امنگوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کیونکہ انگریزی اخباروں کی نسبت اردو اخباروں کا ہاتھ عوام کی نبض پر زیادہ ہوتا تھا اور عوام میں جب بھی کبھی کوئی ہیجان پیدا ہوتا یا کوئی تحریک اٹھتی تو اردو

اخبار اُس تحریک میں عوام کی مدد کے لیے میدان میں فوراً اُتر آئے۔ عوام ہی ہندوستانی زبان کے اخباروں کے حقیقی اور زبردست سرپرست ہوتے تھے اور عوام کی سرپرستی ہی ان اخباروں کا سرمایۂ حیات تھا۔ جب ہمارے ملک میں اسمبلیوں اور کونسلوں کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا تو ہندوستانی یا اردو اخبارات ہی رائے عامہ کو ظاہر کرنے یا اسے منظم کرنے کا کام کرتی تھیں۔ اس لیے اردو صحافت کی عوام کی نگاہوں میں خاص قدر و منزلت تھی اس کے مقابلے میں انگریزی اخبار محض سطحی اور مصنوعی ماحول میں اپنے اثر و رسوخ کی خود فریبی میں رہتے تھے۔ اس مقالہ میں فرداً فرداً اردو اخباروں کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں تاہم یہاں اردو صحافت کی کچھ ناقابل فراموش ہستیوں یا ان کے کارہائے نمایاں کا اشارۃً ذکر کر دیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اردو صحافت میں دو مشہور جرائد کا نام آج بھی ۷۰ یا ۵۷ سال گذر جانے کے بعد نہایت عزت اور احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ الہلال کا اجرا ۱۹۱۲ء میں اور البلاغ کا اجرا ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ ان رسالوں کا نام کاروانِ حریت کے سالار اعظم، دنیائے اسلام کے ممتاز مفسر القرآن حضرت فیروز بخت محی الدین ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء — ۱۹۵۸) سے وابستہ ہے۔ مولانا صاحب نے ان رسالوں کے ذریعے ہندوستانیوں کو عموماً اور اسلامیان ہند کو خصوصاً آزادیٔ وطن کا وہ روح پرور پیغام دیا کہ انگریزی حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی اور مولانا محترم و ممدوح پر مصائب کے دَور پر دَور گزرے لیکن اس مردِ مجاہد کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ مولانا آزاد اکثر پیغمبر اسلام سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کو اپنی مشعلِ راہ مانتے تھے کہ ظالم اور جابر حاکم کے سامنے حق اور ایمان کا اعلان اور اقرار کرنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مولانا صاحب کو انگریزی حکومت نے اپنے عتاب کا نشانہ تو بنایا ہی تھا لیکن آپ اس سے بھی کڑی آزمائش سے سرخرو اور سرفراز ہو کر نکلے۔ جس میں قائد اعظم کہئے یا فراڈ اعظم محمد علی جناح کے ہٹلری غنڈوں نے طوفانِ بدتمیزی بپا کر کے آپ کی ذاتِ گرامی کو ڈال دیا تھا۔

اب ہم اپنے نزدیک کے گرد و پیش یعنی پنجاب اور ہریانہ کی ۱۹۴۷ء سے پہلے

اردو صحافت پر نظر ڈالیں اور اُن دیش بھگت اردو اخبار نویسوں کو یاد کریں جنھوں نے غلامی کے زمانے میں آزادی کے پرچم کو تھامے رکھا۔ یاد رہے جب پنجاب کا ہم ذکر کر رہے ہیں، آج کا ہریانہ اُس کا حصہ مانا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے لاہور شہر اس علاقہ کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مرکز تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ کئی پہلوؤں سے شہر دہلی سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا تو یہ کوئی مبالغہ آمیزی نہیں ہوگی۔ اس شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہت سے اخبار شائع ہوتے تھے جو اپنے موقف کے مطابق لکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً سبھی اخباروں کی کسی نہ کسی سوال پر انگریزی سرکار سے ٹکر ہو ہی جاتی تھی اور ان کے مالکوں یا ایڈیٹروں کو جیل یا جرمانہ کی سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔ لاہور کے روزنامہ "زمیندار" کے مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کا قلم تھا کہ آتش فشانی ہی کرتا رہتا تھا۔ آپ ایک جادو بیان مقرر بھی تھے۔ لہٰذا باغیانہ تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے انگریزی سرکار کی نظر التفات ان پر ہوتی ہی رہتی تھی اور آہنی سلاخوں والے مہمان خانے ان کے سواگت میں ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے اپنی پیشانی پر اپنا موٹو MOTTO اس شعر کو بنا رکھا تھا جو ہر روز چھپتا تھا اور لاہور میں ہر پڑھے لکھے کی زبان پر ہوتا تھا

نورِ خدا ہے کفر کی باتوں پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اسی طرح لاہور سے مہاشہ کرشن (بچپن کا نام رادھا کرشن) کا اخبار پرتاپ نکلتا تھا۔ مہاشہ کرشن کو آج ہم "بابائے صحافت" کہہ کر عزت اور احترام سے یاد کرتے ہیں "پرتاپ" بھی ہمیشہ انگریزی سرکار کے زیر عتاب رہا۔ حصولِ آزادی کے بعد پرتاپ جالندھر اور دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اس مقالہ کو ہم نے ۱۹۴۷ء کے پہلے کی اخبار نویسی تک ہی محدود رکھا ہے۔ آجکل شری ویریندر جالندھر سے پرتاپ چلا رہے ہیں۔ آپنے جنگ آزادی کے دوران قید و بند کے دن بھی دیکھے ہیں۔ "ملاپ" اخبار کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ سورگیہ لالہ خوشحال چند جی خورسند اور ان کے بیٹے شری رنبیر۔ یش اور یدھویر اخبار نویس بھی رہے

اور انھوں نے آزادی کی لڑائی میں بھی حصہ لیا۔ شری رنبیر اب نہیں رہے۔ آپ کو لاہور کے ایک مقدمہ سازش میں پھانسی کی سزا بھی ہوئی لیکن بعد میں آپ اس مقدمہ میں بری ہو گئے۔ آپ نے بھی طویل نظر بند کے دن جیلوں میں کاٹے۔ لاہور کے دوسرے دیش بھگت اخبار نویسوں میں سرکردہ ہستیوں میں میلا رام وفا، نانک چند ناز، دینا ناتھ آتش احرار لیڈر مولانا مظہر علی اظہر، بلدیو ــــ اور شورش کاشمیری کے نام قابلِ ذکر ہیں

یہاں ہم نے میلا رام وفا کا ذکر کیا۔ وفا صاحب کی ہمہ گیر شخصیت میں کئی اوصاف یکجا موجود تھے۔ آپ سرگرم سیاسی کارکن، آزمودہ اخبار نویس اور زبردست شاعر تھے۔ آپ کی نظموں میں ایک ایک بند انگریزی سرکار کے لیے چیلنج ہوتا تھا۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

برطانیہ سے کہ دو اب ذلّت غلامی کرنا نہیں گوارا
ہندوستاں ہمارا
برطانیہ سے کہ دو ہندوستاں کے ہم ہیں
برطانیہ تمہارا ہندوستاں ہمارا
برطانیہ تمہارا ہندوستاں ہمارا

ان میں پوشیدہ الفاظ کی سادگی اور چوٹ بڑی زبردست ہے

کہتے ہیں ایک باغیانہ نظم شائع کرنے کے جرم میں وفا صاحب کو عدالت میں پیش کیا گیا تو مقدمہ کی کارروائی کے دوران آپ نے ایک اور نظم لکھ ڈالی اور انگریزی حکومت کے قانون کا منہ چڑا دیا۔

اخبار نویسی کی اس صنعت پر بالتفصیل لکھنا مشکل ہے کیونکہ خلاف قانون چھپے ہوئے اشتہاروں یا پمفلٹوں کا کوئی ریکارڈ کہیں نہیں ملتا۔ البتّہ خلافِ قانون چھپی ہوئی کتابیں کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی ہیں۔ خفیہ لٹریچر کو لکھنے والے اور بانٹنے والے لوگ مجاہدانہ جذبہ رکھتے ہیں اور بڑی لگن اور سوجھ بوجھ سے کام کرتے ہیں انگریزی راج کے دنوں میں لاہور کے سیاسی بوچڑ خانہ یعنی شاہی قلعہ کی کال کوٹھریاں اور تھانوں

حوالاتیں اکثر دیش سیوکوں سے آباد ہی رہتی تھیں کیونکہ خفیہ لٹریچر کے متعلق پولیس کی پوچھ گچھ چلتی ہی رہتی تھی۔ یہاں پھر اردو زبان یا اردو صحافت کی طاقت اور اس کے اثر کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔ انگریزی راج میں سی آئی ڈی کو ہدایت تھی کہ اردو یا دوسری زبانوں میں جو خفیہ لٹریچر اُن کی گرفت میں آئے اُس پر خاص دھیان سے تفتیش کرے اور اُس کے لکھنے والوں اور تقسیم کرنے والوں کو اپنے قابو میں کرے۔ انگریزی میں چھپے انقلابی پرچوں کو حکّام بالا کے غور وخوض کے لیے الگ کر لیا جاتا تھا کیونکہ اکثر پولیس والے خود بھی ان کی زبان سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اُن پر جو کارروائی ہوئی وہ نرم ہی رہتی اس کے برعکس اردو میں سائیکلوسٹائل کیا ہوا خلافِ قانون پولیس کی نگاہوں میں مادہ آتشگیر سے کم نہیں ہوتا تھا۔ وجہ صاف ہے' ایک تو ممنوعہ پھل میٹھا ہوتا ہے' دوسرے ان میں دبے خیالات وخبریں عوام کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے اور ان کو لکھنے اور بانٹنے والے جنتا کی نظروں میں ہیرو بن جاتے تھے۔ جنگ آزادی میں اردو صحافت کے رول کے بارے میں اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

جنگ آزادی میں اردو صحافت کے اس مختصر سے مقالہ کے بعد ہم یہی امید کر سکتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں صحافت بالعموم اور اردو صحافت بالخصوص ان شاندار روایتوں کو زندہ رکھے گی اور ہمارے صحافی پرانے دیش بھگتوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔ ہمارا ملک غیر ملکی تسلّط سے آزاد تو ضرور ہو چکا ہے لیکن سوشلزم اور جمہوریت کے لیے جنگ ابھی جاری ہے اور ہم سے اُسی اخلاقی جرائت اور جذبۂ ایثار کی طلبگار ہے' جس کا ثبوت ہمارے بزرگوں نے دیا تھا۔ کیا ہم اپنے نصب العین کے حصول کی قیمت دینے کو تیار ہیں ؟

سنہ ۱۸۵۷ء کا اردو ادب

اور

جعفر تھانیسری

خورشید مصطفیٰ رضوی

۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب کو کسی رُخ سے اور کسی پہلو سے دیکھا جائے وہ وطن کو غلامی سے نجات دلانے کی ایک ایسی عدیم المثال کوشش تھی جس کی تابانیاں، جس کے اثرات، جس کی قربانی و ایثار کے جذبات بعد کی تمام تحریکوں میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اگر میں یہاں یہ کہہ کر آگے بڑھوں تو ہم میں سے شاید بہت سے حضرات حیرت سے سنیں گے کہ اس بغاوت کی ابتدا کا سہرا میرٹھ کے سر نہیں بلکہ اس خطۂ انبالہ کے سر ہے جہاں فوجی سپاہ ۱۰ مئی کی صبح کو بغاوت کر چکی تھی لیکن اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت پوری طرح بروئے کار نہ لا سکے جبکہ میرٹھ کی سپاہ نے دہلی آکر فوجی بغاوت کو قومی اور عوامی جدوجہد کا رنگ دے دیا۔ اسی خطۂ زمین پر تحریک ولی اللہی کے جسے وہابی تحریک کہہ کر بدنام کیا گیا، اہم ترین رہنماؤں پر مقدمات چلائے گئے جو "انبالہ ٹرائلس" کے نام سے تاریخ آزادیٔ وطن کا اہم باب ہے جس پر ہم اسی مقالے میں نظر ڈالیں گے۔

اردو زبان چونکہ ہندوستان کے مشترک تہذیب و تمدن کی نمائندہ اور نشان ہے اس لیے اردو کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا آئینہ نظر آتی ہے اور اس نے ہر دَور میں ہمارے معاشرے اور سماج کے فکر و نظر کی عکاسی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کا دامن حب الوطنی اور قومی جذبات و احساسات سے مالا مال ہے۔ اس کی شاعری اور نثر نگاری میں دیش بھگتی کے اتھاہ چشمے پھوٹتے نکلتے ہیں، وطن کی عظمت کے نغمے اُبلتے ہیں، آزادیٔ وطن کے بے پناہ جذبات اور سرفروشانِ وطن کے لیے

خلوص وعقیدت کے زندہ جاوید نقوش ہیں۔

اردو کا ادبی سرمایہ ہماری تاریخی تگ وتاز اور آزادیٔ وطن کی جہدِ مسلسل کا مُنہ بولتا مرقع ہے لیکن اُسی دور کی خارجی پابندیوں نے شعراء کے لب ولہجے میں ماورائیت، شعر کی داخلی فضا میں گھٹن، زمانۂ ماضی کی ماتم سرائی اور حال سے مایوسی کے ساتھ مستقبل سے ناامیدی پیدا کر دی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی۔ لکھنؤ۔ آگرہ۔ کلکتہ۔ بمبئی وغیرہ سے بے شمار اردو اخبارات نکلتے تھے جن کی تفصیل گارساں دتاسی نے دی ہے اور عتیق صدیقی نے کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد" لکھ کر اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اردو کے اکثر شعراء اور اخبار نویس ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی زد میں آئے۔ بعض نے عملی حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف جذبات کا اظہار کیا۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے تو کہا تھا کہ ان اردو اخباروں نے بغاوت بھڑکانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اکثر مشہور شعراء اُن دنوں دہلی لکھنؤ وغیرہ میں موجود تھے۔ مثلاً آزردہ۔ صہبائی۔ شیفتہ۔ غالب۔ ان میں سے اکثر شعراء نے انقلاب پر نظمیں کہی ہیں۔ غالب کے بہت معروف اشعار ہیں:

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خون ہے مسلماں کا

تحریک کے بعد دلی جذبات یاس انگیز اشاریت میں تبدیل ہو گئے جو اُس دَور کے ہر شاعر کے یہاں نظر آتی ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے اکثر اشعار میں یہ رنگ نظر آتا ہے مثلاً یہ معروف شعر

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا جو اِن پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

یا یہ شعر جو انھوں نے اپنی گرفتاری اور جلاوطنی کے دَور میں کہے

کر رحم غریبی پہ مری گردشِ ایام

بدعہدیٔ دوراں نہ کر اتنا مجھے بدنام

کیوں چرخِ ستم گر مرا یہ حال تباہ ہے

شہباز کو گنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

لیکن دورانِ بغاوت کے ایسے بھی اشعار ہیں جن میں یہ مایوسانہ رنگ نہیں ہے اور شاید زیادہ معروف بھی نہیں مثلاً ایک قطعہ تہنیت جو ظفر نے عید قرباں کے دن جنرل بخت خاں کو بھیجا:

شکرِ اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو

گورکھا گورے سے تا گوجر نصاریٰ قتل ہو

آج کا دن عیدِ قرباں کا جبھی جانیں گے ہم

اے ظفر تہہ تیغ جب دشمن تمہارا قتل ہو

ایک اور قطعے کا شعر ہے:

قتل اغیار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر

نام کو بھی نہ جہاں میں سرِ انگریز رہے

منیر شکوہ آبادی اور نفیس بدایونی بھی آزادی پسند شعراء کی صف میں آتے ہیں۔ ظہیر دہلوی بھی گردشِ انقلاب سے حیران و پریشاں ہوئے اور اپنی سرگذشت "داستانِ غدر" لکھی، بعض جگہ واقعات کی تصویر کشی بہت خوب ہے مگر ایک غلطی کی جانب اشارہ ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ جنرل بخت خاں کا جو احوال انھوں نے بیان کیا وہ قرینِ قیاس نہیں ہے یا تو انھیں غلط فہمی ہوئی ہے اور یا بخت خاں کی تصویر مسخ کرنے کے لیے انھیں مجبور کیا گیا ہے۔ دہلی کے کوتوال معین الدین نے "خدنگِ غدر" کی صورت میں یادداشت مرتب کی جیون لال نے روزنامچہ لکھا اور ان دونوں کو چارلس مٹکاف نے TWO NATIVE NARRATIVES کے عنوان سے تحریف کر کے چھاپا۔ حکیم احسن اللہ نے بھی اپنی یادداشت قلم بند کی جو قلمی صورت میں ہے۔ عبداللطیف کا روزنامچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حال ہی مرتب کر کے شائع

کیا۔ بدایوں کے کلکٹر کی داستان کا ترجمہ "مصائبِ غدر" کے عنوان سے ہوا۔ فرانسیسی عورت ہورنسٹ انگلیسی کی سرگذشت کا ترجمہ پہلے فارسی اور پھر اردو میں "ایامِ غدر" کے عنوان سے ظفر حسن امروہوی نے کیا۔ بجنور کا ایک قلمی روزنامچہ علی گڈھ میں محفوظ ہے۔ فتح محمد تائبؔ کی مثنوی مولانا احمد اللہ شاہؒ کے حالات پر ہے۔ کنہیا لال نے "محاربۂ عظیم" اور مکند لال نے "تاریخ بغاوتِ ہند" مرتب کی۔ سرسید نے "اسباب بغاوتِ ہند" لکھ کر انگریزی بربریت کے آڑے آنے کی ناکام کوشش کی' وفاداروں' کی تعریفوں کے پُل "خیر خواہ مسلمانانِ ہند" لکھ کر باندھے اور "تاریخ سرکشی بجنور" بھی مرتب کر کے اس عوامی تحریکِ آزادی کو سرکشی اور غدر سے تعبیر کیا۔ حالیؔ کا مسدس اسی تحریک کی صدائے بازگشت ہے۔ انھوں نے دہلی کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔

دراصل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد ہی اردو کے شعراء اور ادیب نئی صورتِ حال کی نزاکتوں سے آگاہ ہونے لگے تھے۔ سراج الدولہ کی شہادت پر رام نرائن موزوں یہ شعر پڑھتا اور روتا پھرتا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

ایک قدیم معروف اور میرے ہم وطن شاعر مصحفیؔ امروہوی نے تو یہاں تک کہہ دیا:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

امروہہ کے ہی ایک اور جلیل القدر صوفی عالم اور شاعر شاہ سید محمد امین غازی نے ایک مثنوی "فیروزی نامہ" کے عنوان سے مرتب کی جو ابھی تک قلمی صورت میں محفوظ ہے۔ مثنوی فارسی میں ہے لیکن دو شعر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

ہمی خواستم از درِ کبریا
کہ از ہند برقومِ بدبے حیا
نصاریٰ دریں ملک گردد تباہ

گرفتارِ وہم گشتہ و رُو سیاہ

(میری خدا سے یہی دعا ہے کہ ہندوستان سے اس بد اور بے حیا قوم کو نکال دے

انگریز اس ملک میں تباہ ہوں، گرفتار ہوں، قتل ہوں اور ذلیل و خوار ہوں)

ایک شعر اور سن لیجئے جس میں اپنے بیٹے کے لیے خدا سے دعا کرتے ہیں :

مجاہد چنانش کُن اندر غزا

کزو تا رسد بر نصاریٰ سزا

(اُسے جنگ کے میدان میں ایسا مجاہد بنا دے کہ وہ انگریزوں کو سزا دے سکے)

جب ہم اردو ادب پر تحریک ۵۷ء کے اثرات کا ذکر کریں تو اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اس وقت تحریک کی نوعیت کو واضح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ بیشتر حالتوں میں اسے قہرِ الٰہی، فریبِ تقدیر، انقلابِ زمانہ اور اعمالِ بد کی سزا تصور کیا گیا۔ ناکامی کے بعد اس کے علاوہ چارہ کار بھی کیا تھا۔ بعض حلقوں میں جو حکومت کے زیرِ اثر تھے اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ حکومت کے خلاف بغاوت، سرکشی اور غدر ہے۔ یہ خیال اسقدر غالب کر دیا گیا کہ تحریک ۵۷ء کو قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہت دیر لگی۔
مذکورہ بالا تصانیف میں سے بعض کا تجزیہ کرنے سے ہم چند قابلِ ذکر نتائج پر پہنچتے ہیں۔ غالب پہلے ادیب تھے جنھوں نے انگریزوں کے کارناموں کو کئی پہلوؤں سے ترقی پسند پایا۔ انھوں نے ایک روزنامچہ بھی فارسی میں "دستنبو" کے عنوان سے لکھا۔ ان کے اکثر خطوط سے بھی دہلی کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی کو، جو جید عالم، شاعر اور ادیب تھے، دو بیٹوں سمیت گولی سے اڑا دیا گیا تھا مولانا صہبائی اگرچہ دہلی میں مقیم تھے مگر وطن اُن کا دراصل تھانیسر تھا۔ ممتاز عالم مولانا فضلِ حق خیرآبادی انڈمان بھیجے گئے جہاں انھوں نے بغاوت کے حالات عربی میں "الثورۃ الہند" کے عنوان سے لکھے جس کا اوپر ترجمہ "باغی ہندوستان" کے نام سے ہوا ہے۔ ریواڑی کے ایک معزز شخص مان سنگھ نے راؤ تلارام کے حالات اردو میں "ابھیر کلدیپکا" کے عنوان سے قلم بند کیے۔ منیر شکوہ آبادی دبستانِ لکھنؤ کے مشہور

ادیب و شاعر تھے، متعدد تصانیف ہیں، نواب فرخ آباد کے دربار سے وابستہ تھے، گرفتار کر کے کالے پانی کی سزا ہوئی اور پھر واپس آئے۔ انھوں نے مختلف نظموں میں اپنے مصائب اور قومی تباہی کو بیان کیا ہے۔ ایک نظموں کا مجموعہ "فغانِ دہلی" ہے جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ قابلِ ذکر اس لیے ہے کہ اس میں دہلی کی قتل و غارت گری پر تقریباً چالیس شعراء کی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ لکھنؤ کے شاعروں کا بھی یہی لب و لہجہ ہے اور وہ بادشاہ اور شہر لکھنؤ سے اپنی وفاداری کے راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں مقامی حالات کا مرثیہ سا معلوم ہوتی ہیں۔

واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ اردو شعراء اور ادیبوں کا اہم مرکز تھا۔ ناسخ اور آتش اگرچہ وفات پا چکے تھے لیکن ان کے شاگردوں سے بھرا پڑا تھا۔ برق۔ اشک۔ مہر۔ منیر وغیرہ تھے۔ خود بادشاہ کے دربار سے اسیر۔ برق۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں سرور وغیرہ وابستہ تھے، جتنا لکھا جاتا کم تھا لیکن شعراء کی اس کثرت کے باوجود ۵۷ء پر زیادہ مواد دستیاب نہیں ہوتا اور جو کچھ ملتا ہے اس میں غم کا اظہار تو ہے، غصے کا کہیں نہیں اگرچہ اس وقت لکھنؤ میں غم و غصے کے جذبات کی انتہا نہ تھی لیکن غصے کے اظہار پر پابندیاں تھیں، اسی لیے صرف غم کی داستانیں محفوظ رہ سکیں وہ بھی صرف وہ جن میں انقلاب کا بانی فلکِ ناہنجار اور چرخِ ستم گر کو گردانا گیا ہے۔ خود واجد علی شاہ نے اپنے مصائب پر ایک مثنوی "حُزنِ اختر" لکھی تھی۔ برق نے اودھ کا شہر آشوب لکھا۔ صفیر کاکوروی نے واجد علی شاہ کے حالات پر ایک مثنوی لکھی۔ آغا ججّو شرف نے یہ حالاتِ مثنوی کے انداز میں بعنوان "فسانۂ لکھنؤ" نظم کیے۔ یہ قلمی صورت میں ہے۔ اس میں شاہِ اودھ کا سفر کلکتہ، برجیس قدر کی تخت نشینی، چہٹ کی جنگ وغیرہ کے حالات بیان کیے ہیں۔ شنکر پور کے رانا بینی مادھو اور نیپال کے راجہ جنگ بہادر کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

سنے بینی مادھو نے جب یہ کلام
دلیرانہ راجہ کو بھیجا پیام

تمہیں اپنے مالک سے ہے انحراف
تمہیں کو ہے زیبا دھرم کے خلاف
رہیں گے یہیں اب شب و روز ہم
نہ پیچھے ہٹیں گے دھرم کی قسم

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ "فسانۂ عجائب" کے مصنف اور خاص اسلوبِ تحریر کے مالک تھے، دربار اودھ سے وابستہ رہے، اپنے خطوں میں ملک اور شاہِ اودھ کی حالت کا ذکر کیا ہے۔ شیخ امان علی سحرؔ بھی دربار لکھنؤ سے وابستہ تھے، برقؔ کے شاگرد تھے، دیوان "ریاضِ سحر" مطبوعہ ہے۔ ایک طویل مثنوی میں لکھنؤ کے ماضی و حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ نے جو نسیمؔ دہلوی کے شاگرد اور اودھ کے درباری تھے ایک منظوم فارسی عرضداشت واجد علی شاہ کو کلکتہ بھیجی۔ ایک شعر ہے:

نصاریٰ طمع کرد بر ملک و مال
فتاد اخترِ لکھنؤ در وبال

۱۸۹۲ء میں منشی فدا علی عیشؔ نے "فسانۂ عجائب" کے انداز پر ایک قصہ "فسانۂ دلفریب" کے عنوان سے لکھا۔ دربارِ اودھ کے ایک شاعر محمد رضا خاں عاشقؔ نے بھی "رشکِ ماہِ تمام" کے عنوان سے مثنوی لکھی۔ اس میں تقریباً چودہ سو اشعار ہیں، قلمی صورت میں ہے۔

اگر ہم ۱۸۵۷ء کے بعد کے اردو ادب کا تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ مذہبی اندازِ فکر میں قومیت کا جذبہ پنہاں ہے لیکن اس کے واضح تر اظہار کے لیے ہمیں بیسویں صدی کی تصانیف دیکھنا ہوں گی کیونکہ قومی شعور کے ارتقا کی داستان قدرے طویل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً ہی بعد ایک اور اہم شخصیت سامنے آتی ہے اور وہ ہیں تھانیسر کے مولوی جعفر جن کی تصانیف اور کردار میں مذہبی رنگ ضرور ہے مگر قومیت اور وطنیت کا جذبہ ہر پہلو سے جھلکتا ہے۔ جعفر تھانیسری وہ واحد شخص ہیں جن کا تفصیلی ذکر ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب OUR INDIAN

MUSLIMS میں کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"تھانیسر کا منشی جعفر جو خلیفہ کہلاتا تھا، ایک بہت بڑا آدمی تھا۔ وہ بنگالیوں اور ان کے اسلحہ کو کیمپ تک پہنچاتا تھا۔ یہ تھانیسر میں عرضی نویس تھا...... معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی مخلص شخص تھا۔ اس کے پاس جو کوئی آتا اثر قبول کیے بغیر نہ رہتا۔"

ہنٹر نے ان کے پورے حالات بیان کیے ہیں کہ وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن اپنی محنت اور صلاحیت سے قصبے کے نمبردار ہو گئے، قانون کا بھی مطالعہ کیا اور عرضی نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ عرضی نویس ایک طرح کے غیر رجسٹرڈ وکیل ہوتے تھے۔ ہنٹر کا بیان ہے کہ ایک دن وہ اتفاقاً ایک وہابی مولوی کا وعظ سننے کے لیے ٹھہر گئے اور اس سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ ہمہ تن جہاد اور مذہبی اصلاح کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ وہ پٹنہ بھی گئے اور صادق پور میں ٹھہرے۔ یہ مذہبی اصلاح کی تحریک جس نے انھیں ہمہ تن جذب کر لیا، دراصل اُس تحریکِ آزادی سے متعلق تھی جس کی خفیہ سازش کا جال بنگال سے پشاور تک پھیلایا جا چکا تھا اور پٹنہ اس کا خاص مرکز تھا۔ بہتر ہوگا کہ تحریک کا ایک مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔ یہ دراصل مذہبی اصلاح کے رنگ میں آزادیٔ وطن کی تحریک کا اہم ترین باب ہے۔ تحریک کے رہنما چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر تھے اس لیے اس کو تحریک ولی اللہی کے نام سے یاد کرنا مناسب ہوگا۔ یہی وہ تحریک ہے جسے انگریزوں کے اشارے پر وہابی تحریک کہہ کر بدنام کیا گیا۔ اس تحریک کے مجاہد علمائے کرام نے تقریباً نصف صدی یعنی ۱۸۲۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جس بے جگری سے فوجی تنظیم کے ساتھ دشمنانِ وطن کا مقابلہ کیا اور تمام ملک میں اس کا جال پھیلایا، تاریخ کے صفحات اس کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہیں گے۔ یہ تحریک عملی طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ نے شروع کی اور مسلمان عوام و خواص میں جذبۂ جہاد کی روح پھونک دی۔ تحریک کا خاص مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے

ساتھی مجاہدین کو لے کر ۱۸۲۶ء میں صوبہ سرحد چلے گئے اور وہاں مرکز بنایا لیکن جانے سے پہلے تمام ملک کے مختلف علاقوں مثلاً حیدرآباد دکن ۔ مدراس ۔ بمبئی ۔ بنگال ۔ اودھ روہیلکھنڈ ۔ پنجاب وغیرہ میں اپنے خفیہ ایجنٹوں یعنی خلفاء اور مرکزوں کا جال بچھا دیا ۔ جہاں سے روپیہ اور آدمی برابر سرحد کی طرف بھیجے جاتے رہے ۔ مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ گاوؤں تک کی مسجدوں میں واعظ، مبلّغ اور مولوی موجود تھے جو اصلاح اور جہاد کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان کسان تک اس قدر متاثر تھے کہ اپنی قلیل آمدنی سے ہر ہفتے اس مقصد کے لیے روپیہ نکالتے اور سرحد پر بھجواتے تھے ۔ سرکاری ملازمین اس مقصد کے لیے چھٹی لیتے تھے کہ وہ جہاد میں شرکت کا فریضہ ادا کریں گے ۔ یہ تمام واقعات ہنٹر نے بھی بیان کیے ہیں ۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد بھی تمام سرگرمیاں بدستور جاری رہیں ۔ مولوی ولایت علی اور عنایت علی نے آزادی اور جہاد کا پرچم بلند رکھا ۔ چنانچہ ہنٹر کا بیان ملاحظہ ہو :

"ایک بار پھر اس مذہبی تعصب والوں کا کام تباہ ہوتا ہوا معلوم ہوا مگر پٹنہ کے خلیفاؤں کے جوش و جذبے نے اسے قائم رکھا اور اپنے لامحدود وسائل کے بل پر اس مقدس مذہبی پرچم کو پھر سے اونچا کر دیا ۔ انھوں نے پورے ہندوستان میں اپنے ایجنٹ پیام بروں کا جال بچھا دیا اور وہ سب سے بڑی مذہبی احیا کی تحریک چلائی، جو کبھی اس سے پہلے نظر نہ آئی تھی ۔"

مولوی عنایت علی نے سرحد کے مرکز استھانہ میں تحریک کی فوجی کمان سنبھالی، پٹنہ کا مرکز کثیر رقمیں اور آدمی تمام ملک سے جمع کر کے سرحد کو سپلائی کرتا رہا اور سرحد پر مجاہدین کی تیغِ آبدار بے نیام ہو کر جھلکتی رہی ۔ ۱۸۴۴ء میں مولوی ولایت علی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پٹنہ سے چلے، ہری پور کے مقام پر گرفتار ہوئے، لاہور لائے گئے ۔ دونوں بھائیوں کو پٹنہ میں دس ہزار کی ضمانت پر چھوڑا گیا اور چار سال کے لیے نظر بند کر دیا گیا لیکن انھوں نے اس پابندی کی پرواہ نہ کی اور جلد ہی پھر

اپنے مرکز سے رابطہ قائم کرلیا۔ ولایت علی نے پٹنہ میں پھر کام شروع کیا۔ عنایت علی بنگال پہنچے۔ راج شاہی ڈویژن میں ان کی موجودگی کا علم ہونے پر مجسٹریٹ نے تحقیقات شروع کی مگر وہ بچ نکلے اور پٹنہ آ گئے۔ یہاں پھر نظر بند کر دیئے گئے۔ عنایت علی جلد ہی سرحد جا پہنچے اور فوج کی کمان سنبھالی۔ ۱۸۵۰ء کے آخر میں ولایت علی بھی ڈھائی سو آدمی لے کر ستھانہ چلے گئے۔ اس دوران وہ دہلی کی فتح پوری مسجد کے قریب ٹھہرے اور جمعہ کی نمازوں میں جہاد کے لیے تقریریں کیں۔ بہادر شاہ نے ان کو وعظ کے لیے قلعے میں مدعو کیا جہاں ان کے معتقدین پیدا ہو گئے۔ یہاں سے سوات وغیرہ کے علاقوں میں جا کر وہ بہار اور بنگال میں تحریک کے کارکنوں سے نامہ و پیام کرتے رہے۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کمشنر کو ایک خط میں لکھا تھا:

"۱۸۵۲ء میں ایک باغیانہ خط و کتابت پنجاب کے حکام نے پکڑی تھی جس سے سرحد میں ہندوستانی مولویوں کی کوششوں کا پتہ چلا جو وہ راولپنڈی میں مقیم رجمنٹ نمبر ۴ این آئی (پیادہ فوج) کو ورغلانے کے لیے کر رہے تھے۔ یہ سازش پٹنہ میں منظم کی گئی ہے اور خطوں میں صادق پور کے مولویوں کا ذکر تھا.... سید اکبر شاہ والئی سوات ان کے ساتھ ہے تاکہ برٹش گورنمنٹ سے جنگ کریں.... آدمی اور رسد پٹنہ سے میرٹھ اور راولپنڈی ہو کر، جہاں ایجنٹ مقرر ہیں، سرحد تک پہنچتے ہیں۔"

ادھر سرحد میں مولوی عنایت علی نے حملے کر کے انگریزوں کو شکستیں دیں لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہو جانے پر پٹنہ اور سرحد کے درمیان رابطہ ٹوٹ گیا۔ پھر بھی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۸ء تک انھوں نے سرحدی قبیلوں اور ہندوستانی مجاہدین کو انگریزوں کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف رکھا۔ بیس مرتبہ انگریزی فوج ان کے خلاف مہم پر بھیجی گئی مگر یہ سرگرمیاں ۷۱-۱۸۷۰ء تک جاری رہیں۔ مولوی عنایت علی اور ولایت علی کے بعد مولوی یحییٰ علی نے تحریک کی سربراہی کی۔ یہاں تک کہ ۶۴-۱۸۶۳ء میں ان کے بڑے بڑے لیڈر مولوی یحییٰ علی۔ مولوی جعفر تھانیسری اور محمد شفیع وغیرہ

گرفتار کر کے انبالہ بھیجے گئے اور مقدمہ چلا کر سزائیں دی گئیں۔ تاریخ کے صفحات پر یہ واقعات 'انبالہ ٹرائلس' کے نام سے ثبت ہیں۔ ۱۸۶۵ء میں مولوی احمد اللہ وغیرہ پر مقدمہ چلایا گیا۔ مالدہ اور راج محل میں ۱۸۷۰ء میں مقدمہ چلا۔ ۱۸۷۱ء میں پٹنہ کے پانچ مولوی جلاوطن ہوئے۔ اس تحریک کی تمام تفصیلات متعدد کتابوں میں بیان ہوئی ہیں مثلاً کے کے دتہ کی FREEDOM MOVEMENT IN BIHAR۔ تاراچند کی "ہسٹری آف فریڈم مومینٹ"۔ ہنٹر کی 'OUR INDIAN MUSLIMS'۔ اردو میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ"۔ غلام رسول مہر نے تین ضخیم جلدوں میں تحریک کی پوری تاریخ قلم بند کر دی ہے۔ حال ہی میں سید احمد شہیدؒ اور ان کی تحریک پر چند کتابیں انگریزی میں شائع ہوئی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہر جگہ اسے 'وہابی تحریک' کہا گیا ہے۔

جعفر تھانیسری اس تحریک کے اہم رکن اور رہنما تھے، مولانا یحییٰ علی کے خلیفہ تھے، روپیہ وغیرہ انھیں کے ذریعے سرحد تک پہنچتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی شروع ہونے پر وہ اپنے دس مریدوں کے ہمراہ سرحد چلے گئے اور جنگوں میں حصہ لیا۔ بغاوت کے دوران وہاں سے انگریزوں پر حملے کرتے رہے تاکہ اس بغاوت سے فائدہ اٹھا کر وطن کو آزاد کرایا جائے۔ لیکن تحریک کی ناکامی کے بعد تھانیسر واپس آ گئے اور بظاہر عرائض نویسی لیکن دراصل تحریکِ ولی اللہی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۸۶۴ء میں گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کا وارنٹ تھانیسر بھیجا گیا لیکن وہ چھپ چھپا کر دہلی اور پھر علی گڈھ پہنچے، وہیں گرفتار ہوئے، دہلی لا کر ایک تنگ و تاریک تہ خانے میں قید کر دیئے گئے پھر انبالہ لائے گئے اور اپریل ۱۸۶۴ء میں مقدمہ چلایا گیا۔ ہنٹر نے لکھا ہے کہ:

"اس کا ایک منشی اپنے آقا کے سخت امتحان کے وقت بھی وفادار رہا، اور انبالہ سیشن جج کی عدالت میں اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو گواہی دیتا رہا"

ہنٹر نے یہاں اُن کی ایک تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے جو مذہبی وعظ و نصیحت پر مبنی تھی اور انبالہ کے اس مقدمے میں پیش کی گئی۔ ہنٹر کا یہ اعتراف ... دیکھیے۔

"جعفر عرضی نویس اور یحیٰی علی رئیس المبلغین نے اپنی وفاداری کا کبھی جھوٹا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں۔ وہ بڑے مخلص اور با اصول انسان تھے ... تاریخ ان کے انجام کو پُر رحم جذبات کے ساتھ یاد کرے گی۔"

جعفر تھانیسری نے اپنی تمام سرگذشت کتابی صورت میں مرتب کی جس کا عنوان "تاریخ عجیب" یا کالا پانی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انبالہ جیل میں ان پر سخت مار پیٹ کی گئی تاکہ وہ خفیہ رازوں کا انکشاف کر دیں مگر کسی طرح کامیابی نہ ہوئی حتیٰ کہ ان کے چھوٹے بھائی کو مار پیٹ کر ان کے خلاف گواہ بنا لیا گیا مگر اُس نے بیان بدل دیئے۔ ایک ہفتے تک مجسٹریٹ کے یہاں پیشی کے بعد مقدمہ سیشن جج انبالہ کے سپرد ہوا۔ "تاریخ عجیب" میں انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ آخری دن یعنی ۲ر مئی ۶۴ء کو فیصلہ سُناتے وقت جج نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم بہت عقل مند، ذی علم، قانون داں اور اپنے شہر کے نمبردار رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری فراست کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا.... تم کو پھانسی دی جائے گی، تمہاری لاش بھی وارثوں کو نہیں دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت سے گورستان جیل میں گاڑ دی جائے اور میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہونگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس آخری فقرے کے جواب میں میں نے کہا کہ "جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ قادر توانا ہے کہ میرے مرنے سے پہلے آپ کو ہلاک کر دے۔" اُس وقت میرے مُنہ سے یہ الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو زندہ موجود ہوں مگر وہ یہ حکم دینے کے تھوڑے عرصے بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوا۔"

اس مقدمے میں تین آدمیوں کو یعنی جعفر تھانیسری، یحیٰی علی اور محمد شفیع کو پھانسی اور باقی آٹھ کو عبور دریائے شور مع ضبطی جائداد کی سزا ملی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پھانسی کی سزا سن کر میں اور مولوی یحیٰی علی اس قدر بشاش اور مسرور ہوئے کہ انگریز حکام حیرت زدہ رہ گئے۔ ۱۶ر ستمبر کو پھانسی ہونا تھی لیکن یہ غیر معمولی مسرت دیکھ کر سزا عبور دریائے شور یعنی

کالے پانی میں بدل دی گئی۔ تاہم ہنٹر نے لکھا ہے کہ اپیل پر سزا تبدیل ہوئی اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ بہر حال، جنوری ۱۸۶۶ء میں انڈمان پہنچے۔ جعفر تھانیسری اٹھارہ سال انڈمان میں مقیم رہے، شادی بھی کی، اولاد بھی ہوئی اور پھر ۱۸۸۳ء میں رہا ہو کر واپس آئے۔ انکی تصانیف میں "سوانح احمدی" "تاریخ عجیب" اور چند مذہبی رسائل ہیں۔ 'سوانح احمدی' میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات قلم بند کیے ہیں 'تاریخ عجیب' میں اپنی سرگذشت بیان کی ہے لیکن اسی سلسلے میں اُن پر ایک الزام بھی عائد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے انگریزوں کے اشارے پر تحریک ولی اللہی کا رُخ موڑنے کی کوشش کی اور سید احمد شہیدؒ کی بعض تحریروں میں تحریف و تبدیلی کر کے اسے سکھوں کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس موضوع پر غلام رسول مہر نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی یہ تذکرہ کیا ہے اور حال ہی میں پروفیسر توفیق نظامی امروہوی نے اپنی انگریزی تصنیف (MUSLIM POLITICAL THOUGHT DURING THE EARLY 19TH CENTURY)

میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن بہر حال، اِن جہاد پیشہ رہنماؤں نے اپنے کردار و عمل سے انتہائی تاریک دَور میں بھی آزادی اور انقلاب کا پرچم بلند رکھا اور چکبست کے الفاظ کا صحیح مصداق ثابت ہوئے کہ

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی اور تحریکِ آزادی

ڈاکٹر کمار پانی پتی

محبت کا وطن کی دردِ پنہاں لے کے آیا ہوں
تڑپتا ہوں لبوں پر آہِ سوزاں لے کے آیا ہوں
چھپا کر پردہ شعر و سخن میں اے سخن فہمو
میں اپنے دل کے زخموں کا گلستاں لے کے آیا ہوں
آفتاب پانی پتی

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی ابھی ہندوستان میں ہی آباد تھے اور بھارت سرکار سے تقریباً ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ لے رہے تھے۔ (یہ رقم اُس زمانے میں کافی اہمیت کی حامل تھی) مگر دل ہی دل میں وہ بھارت کو چھوڑ کر پاکستان جانے کی سوچ رہے تھے، کیونکہ اس ملک میں انہیں اردو زبان کا مستقبل کچھ تاریک سا نظر آرہا تھا۔ اسی دوران وہ ایک مرتبہ پاکستان گئے اور غالباً وہاں کی سرکار اور وہاں کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ہندوستان سے متعلق ایک نظم پڑھی، جس میں انھوں نے فرمایا ؎

اے ہمنشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
بربط کے دل سے اٹھتی ہے کیونکر فغاں نہ پوچھ
فتنے اٹھے تو امن کی دولت نہیں رہی
حاصل ہوا عروج تو عزت نہیں رہی
انسان کی وہ قدر وہ قیمت نہیں رہی

انوپ چند
آفتاب
پانی پتی

عشرت ملی تو طرزِ شرافت نہیں رہی
دہشت روا، عناد روا، دشمنی روا
القصہ جو بھی چیز ہے ناکردنی روا
انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

اور پھر آزاد بھارت کے قومی رہناؤں کی سخت تیرہ و تار تصویر پیش کرتے ہوئے جنابِ جوشؔ نے اپنے ہی انداز میں فرمایا ؎

کھدر پہن پہن کے بداطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے
لیڈر جو آج کا ہے وہ بندر ہے آج بھی

انگریز کا غلام گورنر ہے آج بھی

بھارت کی راشٹر بھاشا ہندی کے متعلق انھوں نے فرمایا ؎

حیوان دیکھ دیکھ کے منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے ...

یہ نظم پاکستان کے بیشتر اخبارات میں، بہ حروفِ جلی شائع ہوئی۔ چنانچہ کسی اخبار میں آفتاب کی نظر سے بھی گزری۔ اسے پڑھ کر اُن کے سینے میں بیٹھا ہوا وہ وطن پرست قومی شاعر، جس نے زندگی بھر اپنی ہی سطح پر تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا، یک لخت تڑپ اُٹھا۔ وہ اپنے عزیز وطن کی بے عزتی برداشت نہ کر سکا، اور اپنے جذبات کے شعلے "حضرتِ جوشؔ کی نظم کا دندان شکن جواب" میں بکھیرنے لگا ؎

سُن کر عجیب رنگ میں اپنے وطن کا حال
اِک تیر دل پہ چل گیا، بے حد ہُوا ملال
بندر نظر میں جوشؔ کی ہیں رہبرِ وطن
بہتر ہیں دیوتاؤں سے مے نوش بدچلن
کھدّر پہننے والے سیہ کار ہو گئے
اور بالا تر فرشتوں سے میخوار ہو گئے ...

جنابِ جوشؔ کی ذاتی زندگی کو بھی موضوعِ سخن بنانے سے گریز نہ کرتے ہوئے جنابِ آفتاب نے فرمایا ؎

حیرت ہے وہ لگائیں گورنر پہ اتہام
انگریز کی شراب کے جو لوگ ہیں غُلام
سمجھے ہیں آپ ہند میں کچھ بھی نہیں رہا
برباد مُلک ہو گیا، آزاد کیا ہوا ...

بنا کسی خوف یا جھجھک کے، 'شاعرِ انقلاب کی ذات پر' چوٹ پر چوٹ کرتے ہوئے آفتاب لکھتے چلے گئے ؎

اُن سے بھی کیا زیادہ ہیں، ہم دشمنِ وطن
مذموم جن کے فعل ہیں، اچھے نہیں چلن
جن کی سخن طرازیاں ہیں، بد زبانیاں
دیتے ہیں رہبروں کو شب و روز گالیاں
کرتے ہیں غیر ملک میں جاکر بُرائیاں
جب چھیڑتے ہیں مادرِ بھارت کی داستاں
عیّاشیوں کا درس سکھاتے ہیں وہ مدام
ہے عورتوں سے اور شرابوں سے جن کو کام
کیا اُن سے درس لیں گے میری قوم کے جواں
عیاشیوں میں کٹ گئیں جن کی جوانیاں ...

راشٹر بھاشا ہندی کے سلسلے میں جنابِ جوشؔ کے نظریات کو ایک دم ٹھکراتے ہوئے آفتاب نے فرمایا ؎

بے مثل و بے نظیر ہے، جو دیوناگری
جس میں نہیں ہے آج کسی چیز کی کمی
تُلسی کی، سُورؔ کی ہے، بہارؔی کی جو زباں
آزادؔ[1] جس کو کہتے ہیں اردو زباں کی ماں
جس میں ہیں پریم رس کے مضامین بیشمار
تعریف جس کی کرتے ہیں اہلِ زباں ہزار
لفظوں میں جس کے پریم اور امرت کا ہے مٹھاس
اہلِ ہُنر بجھاتے ہیں جس سے دلوں کی پیاس
اس کے خلاف آج زباں کھولتے ہیں جوشؔ
غیظ و غضب میں آکے بہت بولتے ہیں جوشؔ

[1] محمد حسین آزاد

آفتابؔ کے افکار مضبوط اور محکم عقیدے کی پیداوار ہیں۔

اپنے اس مقالہ میں، مَیں، آفتابؔ کے اُس کلام کا سہارا لے کر، جو انہوں نے تحریکِ آزادی کے دنوں میں تخلیق فرمایا، خصوصاً وہ قومی کلام جو ہماری صدی کی تیسری، چوتھی اور پانچویں دہائیوں میں "سیلابِ اشک"، "نغمۂ رُوح"، "آفتابِ وطن"، "زخمِ وطن" "جذباتِ آفتاب" اور "جوشِ وطن" جیسے قومی مجموعات کی شکل میں منظرِ عام پر آیا، یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آفتابؔ کو واقعی اپنے وطن سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ہندوستان کے ذرّے ذرّے کو دیوتا سمجھتے تھے۔ سخت نفرت تھی انہیں وطن دشمن عناصر سے۔ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اُنہیں وہ بددیانت لوگ جن کی زندگی کی بنیاد ہی خود غرضی، چاپلوسی، اور بے وفائی پر تھی۔ چنانچہ زندگی بھر وہ اُن سرفروشانِ وطن کے گیت گاتے رہے جو سر ہتھیلی پر رکھ کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی میں ڈٹے رہے اور آفتابؔ کی آواز میں آواز ملاکر "ہندوستانی بچوں کا گیت" گنگناتے رہے ؎

مرنے کا ہمیں کیا خوف و خطر، میداں میں کھڑے ہیں سینہ سپر
تم تیروں سے، شمشیروں سے، دل کھول کے ہم پر وار کرو
گو ہندی آج نہتے ہیں، پر ارجن بھیم کے بچے ہیں
ہم قومی آن نہ توڑیں گے، تم تیر جگر کے پار کرو
اے بانکے جوانو! آگے بڑھو، عیاروں سے ہرگز نہ ڈرو
ہاں سنگینوں کے سایہ میں اب کھدر کا پرچار کرو

اُردو شاعری پر تقریباً ہر دَور میں سب سے بڑا اعتراض یہی رہا ہے کہ "اس کے موضوعات بہت محدود ہیں۔ اس میں گُل و بلبل اور جام و مینا کے سوا رکھا ہی کیا ہے"۔ چنانچہ حفیظؔ ہوشیارپوری کے الفاظ میں: "فکر کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ہمارے پیش رَو روایتی حسن و عشق، تصوّف اور زندگی کے تاریک پہلوؤں سے آگے نہ بڑھ سکے"۔ مگر بدقسمتی سے اردو شاعری پر اس تہمت کا لیبل چپکانے والے ناقدینِ اردو شاعری کے اُس بیش بہا خزانے کو اکثر بھول جاتے ہیں، جو ان شعراء نے تخلیق فرمایا۔ جن کے تئیں

اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے آفتاب اپنی نظم "شعرائے وطن" میں لکھتے ہیں ؎

شیدا، سرور، کیفی، چکبست، برق، اکبر
مہر و فدا، افق اور رونق، سلیم، ساغر
بیتاب، حشر، روشن، اقبال اور حالی
سیماب، سیف، ساحر سے تھے بہت سخنور
اب تک بھی چند قومی شاعر ہیں انکے دم سے
دُنیا میں ہیں نمایاں شعر و ادب کے جوہر
جوش و نسیم و انور، سرشار و امن و فکری
مہتہ، کمال، غازی، محروم اور منور
قیس و شہید و طالب، آزاد اور فلک ہیں
ہندوستاں کے شاعر انسانیت کے پیکر
دنیا کی محفلوں میں رہتا ہے ذکر جن کا
کوثر ہیں اور الفت، ساغر ہیں اور گوہر
اے آفتاب میرے محسن ہیں، محترم ہیں
یہ باکمال شاعر، یہ نامور سخنور
درد نہاں رہے گا روشن کلام ان کا
مہر اور ماہ بن کر چمکے گا نام ان کا

خود آفتاب نے بھی انہیں قومی شعراء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زندگی بھر اپنے کلام میں وطن پرستی کی چنگاریاں بکھیریں اور ایسے نغمات تخلیق فرمائے جن میں مادرِ بھارت کے ان گنت سپوتوں کی ان قربانیوں کا عکس ابھر کر سامنے آیا جن کو مشعلِ ہدایت بنا کر ہمارے رہنماؤں نے تحریکِ آزادی نئی سے نئی کامیابی کی منزلوں سے روشناس کرایا۔ چنانچہ آفتاب کا بہت سا کلام اُس زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے جب انگریزی سامراج کی تلوار ہندوستانیوں کے سروں پر لٹک رہی تھی اور بے شمار ابن الوقت غیر ملکی حکومت

کے خوف سے دُبک کر بلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مگر ایسے ماحول میں بھی آفتاب ایسے قلمکار اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غلامی کی بیڑیاں توڑنے میں ہمہ تن مصروف رہے وہ مستی کے عالم میں جھوم جھوم کر وطن پرستی کے نغمات گاتے رہے ؎

سرفروشانِ وطن کا یہ خیال اچھا ہے
ملک کی راہ میں مرنے کا مآل اچھا ہے
ذرّۂ خاکِ وطن مہرِ درخشاں ہے مجھے
وہ سمجھتے ہیں کہ انگلینڈ کا مال اچھا ہے
اپنے مطلب کے لیے ملک کا دشمن جو بنے
ایسے کمبخت کا دُنیا میں زوال اچھا ہے
لاجپت رائے کی شمشان سے آتی ہے صدا
ملک کی راہ میں مٹنے کا خیال اچھا ہے

آفتاب کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ نام کو بھی نہیں۔ وہ سیدھی سادی زبان میں صاف بات کہہ دینے کے عادی تھے۔ ملاحظہ فرمایئے اُن کے یہ مشہور اشعار ؎

جو سبزِ عشقِ وطن کا چمن نہیں رہتا
وطن وطن بھی اگر ہے وطن نہیں رہتا
وہ آدمی نہیں پتھر کا ایک پتلا ہے
کہ جس کے سینے میں دردِ وطن نہیں رہتا
وہ آنکھ آنکھ نہیں اشکِ غم نہ ہو جس میں
وہ قلب کیا ہے کہ جس میں محن نہیں رہتا
جو پوچھتے ہو تو صاف کہہ دوں گا اہلِ وطن
غلام قوم کا کوئی سخن نہیں رہتا

جب آفتاب نے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ شعر کہنا شروع کیا، ہندوستان کی قومی سیاست

پر لوک مانیہ تلک چھائے ہوئے تھے۔ مگر اُن کی وفات کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں اُن کا یُگ ختم ہوگیا۔ آفتاب نے "مہاتما تلک کی وفات پر بھارت ماتا کے دو آنسو" تخلیق فرمائی اور ہندوستان کے اس عظیم سپوت کو اِن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

کس کے غم میں ہندیوں نے پٹیاں باندھیں سیہ
کس کا ماتم ہوگیا گھر گھر بپا پیارے تلک
اُن کے دل کا حال کیا جانے ستمگر آسمان
خون اُمیدوں کا جن کی ہوگیا پیارے تلک
رہبرانِ ملک وملت سے کوئی پوچھے ذرا
تیر کیا سینے پہ ان کے چل گیا پیارے تلک ...

یہ وہ زمانہ تھا جب جلیانوالہ باغ کے زخم ابھی دِلوں پر تازہ تھے اور آفتاب کے یہ اشعار فضاؤں میں گونج رہے تھے ؎

اہلِ ستم نے ہند پر کوہِ الم گرا دیا
بھارت کے چپّہ چپّہ کو ماتم کدہ بنا دیا
بھارت سپوت کس طرح مرتے ہیں قومی آن پر
سینوں پہ کھا کے گولیاں ہم نے تمہیں دکھا دیا

مگر "مہاتما گاندھی کے آنے کی خوش خبری" میں پہلے سے ہی آفتاب اُن امیدوں کا ذکر کرچکے تھے جو گاندھی جی کی ذات سے پوری طرح وابستہ کی جاچکی تھیں ؎

درد سے ہے قوم کے جو بیقرار آنے کو ہے
اپنی نیشن کا ہے جس پر انحصار آنے کو ہے
عیش کی تانیں اُڑا اے بلبلِ خونیں جگر
گلستانِ ہند پر تازہ بہار آنے کو ہے
بے نواؤں کو کلیجے سے لگانے کے لیے
مادرِ بھارت ترا خدمت گُذار آنے کو ہے

راہ میں آنکھیں بچھا دیجے جوانانِ وطن
ایک مدت سے تھا جس کا انتظار آنے کو ہے
جس کے نقشِ پا پہ چلنا فخر ہے سب کے لیے
قوم کا وہ رہنمائے نامدار آنے کو ہے
کس کی آمد کی خوشی کی ہے یہ برکت آفتابؔ
قوم کا نغمہ زباں پر بار بار آنے کو ہے

اور پھر گاندھی جی کے نقشِ پا پہ چلتے ہوئے آفتابؔ نے ہمیں وہ "قومی ترانہ" دیا، جو اُس زمانے میں ہونے والے سیاسی جلسوں میں بار بار گایا جاتا رہا ؎

خامۂ عشقِ وطن سے کھینچ کر نقش و نگار
لوحِ دل پر قوم کی مورت بنانی چاہیے
لب پہ ہوں قومی ترانے اور دلوں میں ولولے
قوم کی ویدی پہ یوں گردن چڑھانی چاہیے
مرتے مرتے داس کے دل سے یہی نکلی صدا
مادرِ بھارت کو آزادی دلانی چاہیے
سرفروشو! نام زندوں میں لکھانا ہے اگر
اپنی ہستی راہِ ملت میں مٹانی چاہیے
اے وطن کے نونہالو، خوابِ غفلت سے اٹھو
امتحاں کا وقت ہے، ہمت دکھانی چاہیے

آفتابؔ کی اَن گنت ایسی تخلیقات مشہور ہوئیں اور تحریکِ آزادی کے دنوں میں قومی تقریبات میں روح پھونکتی رہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے "سوزِ دل" کے یہ اشعار ؎

وطن کے عشق میں یہ حالتِ دلگیر دیکھیں گے
لبوں پر مُہرِ خاموشی، جگر میں تیر دیکھیں گے
کہاں تک قوم کی قربانیاں بے کار جائیں گی

کہاں تک اپنے ہاتھوں ملک کی تحقیر دیکھیں گے

کسے معلوم تھا ہم بے کس و مجبور بھارت میں

پٹیل اور مالوی کے ہاتھ میں زنجیر دیکھیں گے

جگر کے خون سے کھینچا گیا ہے قوم کا چربہ

لہو کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تصویر دیکھیں گے

کبھی تو وہ بھی دن آئے گا جب ہم اپنی آنکھوں سے

جہاں میں ہندیوں کا راج عالمگیر دیکھیں گے

آفتاب کی نظم "باباگاندھی" جو اکثر علاقائی جلسوں میں جذبات کے شعلے بھڑکاتی رہی، اپنے زمانے میں اپنی مثال آپ تھی۔ ملاحظہ فرمایئے اس نظم کے یہ اشعار ؎

سوراج کا جھنڈا بھارت میں گڑوادیا گاندھی بابا نے

قسمت کا ستارا بھارت کی چمکا دیا گاندھی بابا نے

الفت کی راہ میں مرجانا، پر کام جہاں میں کر جانا

یہ پاٹھ وطن کے بچوں کو سکھلادیا گاندھی بابا نے

اے قوم ووطن کے پروانو! لو اپنے فرض کو پہچانو

اب جیل سے یہ پیغام ہمیں بھجوادیا گاندھی بابا نے

چرخے کی توپ چلادو تم، غیروں کے چھکے چھڑادو تم

یہ ہند کا چکر سدرشن ہے، سمجھادیا گاندھی بابا نے

نفرت تھی غریبوں سے جن کو، ہیں شاد اچھوتوں سے ملکر

اک پریم پیالا دنیا کو پلوادیا گاندھی بابا نے

غیروں کے جھانسوں میں آنا دشوار ہے ہند کے بچوں کا

آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھوادیا گاندھی بابا نے

قوم کے جانباز سپوتوں کو قوم ووطن پہ ہنستے ہنستے اپنی جان قربان کردینے کی ترغیب دیتے ہوئے آفتاب نے فرمایا ؎

زیرِ خنجر بھی ترانہ ہند کا گائیں گے ہم
مُسکرا کر تختۂ پھانسی پہ چڑھ جائیں گے ہم
جس کی گرمی سے پگھل جائیں گے دل پتھر کے بھی
آگ وہ عشقِ وطن کی دل میں سُلگائیں گے ہم

اور پھر ۲۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو ۷ بج کر ۲۳ منٹ پر جب انگریزوں نے بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گورو کو پھانسی پر لٹکا دیا اور ستلج کے کنارے اُن کی لاشوں کو مٹی کے تیل سے جلا بُجھا کر دریا میں پھینک دیا' سارا ملک غم کے طوفان میں ڈوب گیا۔ اس موقعہ پر آفتاب نے شہیدوں کی یاد میں کئی نظمیں کہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اُنکی ایک نظم کے یہ خوبصورت بند ؎

گری ہے برقِ تپاں دل پہ یہ خبر سُن کر
چڑھا دیا ہے بھگت سنگھ کو رات پھانسی پر
اُٹھا ہے نالۂ پُر درد سے نیا محشر
جگر پہ مادرِ بھارت کے چل گئے خنجر
شکستہ حال ہوا قوم کے حبیبوں کا
بدن میں خشک لہو ہو گیا غریبوں کا

ابھی تو قوم نے نہرو[1] کا غم اٹھایا تھا
ابھی تو داس کی فرقت نے حشر ڈھایا تھا
ابھی تو ہجر کا بسمل کے زخم کھایا تھا
ابھی تو بخت نے کوہِ الم گرایا تھا
چلے ہیں ناوکِ بیداد پھر کلیجوں پر
کہ آج اُٹھ گئے دنیا سے نوجواں رہبر

[1] پنڈت موتی لال

بسمل کی بحر میں بھی آفتاب نے ایک غزل کہی جس کے یہ اشعار برسوں زبانِ زدِ عام رہے ہیں۔

اِس غلامی پر نہ کیوں ہم موت کو ترجیح دیں
شوقِ آزادی ازل سے اپنے آب و گِل میں ہے
مرحبا! صد مرحبا! اے مادرِ ہندوستاں
تیرے جانبازوں کی شہرت غیر کی محفل میں ہے
خونِ مظلوماں چھپائے گا کہاں بیداد گر
بیکسوں کے خونِ کی بُو دامنِ قاتل میں ہے

یہاں آفتاب کی اُن نظموں کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جو لالہ سمیر چند گپتا، حافظ نور محمد پانی پتی اور لالہ جیوتی پرشاد درد دل تحریکِ آزادی کے دنوں میں اس علاقے میں تقریباً روزانہ ہونے والے جلسوں میں جھوم جھوم کر سنایا کرتے تھے۔ آفتاب کی نظم "زخمِ جگر" اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کیونکہ اس میں کئی ایسی چالاکیوں اور چالبازیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انگریز ہمارے قومی رہنماؤں سے اکثر کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہے

ہمارے ہند کی حالت خراب رہنے دیں
یہ چالبازیاں ہم سے جناب رہنے دیں
نئی سکیم سے آنسو نہ پونچھئے صاحب
ہماری چشم کو غم سے پُر آب رہنے دیں
جو دینا ہے تو ہمیں ہوم رُول دے دیجئے
عدوئے ملک کی خاطر خطاب رہنے دیں
حقیقت اپنی ذرا آنکھ کھول کر دیکھیں
غریب ہند کے عیب و ثواب رہنے دیں
کسی کی چال سے نا آشنا نہیں ہندی
یہ وعدے حشر کے جھوٹے جناب رہنے دیں ...

آفتاب کا کلام ہر لحاظ سے "محسوسات و جذبات کا بحرِ ذخار اور حیات افروز تخیل کا دریائے ناپیداکنار" ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "آفتابِ وطن" کو پڑھنے کے بعد نظرؔ سوہانوی نے ۱۹۳۱ء میں ٹھیک ہی تو فرمایا تھا ؎

"اے غم گسارِ قوم و وطن دل کے دردمند
اِس وقت جب کہ اُف کی سزا بھی ہے قید و بند
تُو نے وطن کی پاک محبت کے جوش میں
اشعار وہ پڑھے ہیں بآوازِ صد بلند
جن کے دلوں میں آتشِ پنہاں ہے مشتعل
جن کے سبب ہے گرمیٔ محفل ہزار چند
بے ساختہ زباں سے نکلتا ہے اے نظرؔ
تجھ پر ہزار آفریں لالہ انوپؔ چند"

اور پنڈت برجموہن دتہ تریہ کیفیؔ دہلوی نے 'لاہور سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار" دیش بندھو" کے ۳۰ جون ۱۹۳۲ء کے شمارے میں آفتاب کے اسی مجموعے سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا : "آفتاب صاحب کے اشعار دل کے خونریز ٹکڑے ہیں جو اُنہوں نے صفحۂ قرطاس پر رکھ دیئے ہیں ... اکثر اشعار ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کا دل ایک بار ضرور تڑپ اُٹھتا ہے ... آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ... ایسی مفید قومی' اخلاقی کتاب سکول کی لائبریریوں میں ضرور ہونی چاہیے اور قومی سکولوں میں تو اسے سکول کورس میں داخل کرنا چاہیے تاکہ طلبار کے دِلوں میں ابتدا سے ہی قومی، مُلکی جذبات پیدا ہوں اور اُن کی ہستیاں مُلک و قوم کے لیے خدائی برکت ثابت ہوں"

مختصر یہ کہ ہریانہ کے پہلے راج کوی لالہ انوپ چند آفتاب پانی پتی واقعی حب الوطنی کے آفتاب تھے۔ اُن کے کلام میں ایک خاص قسم کی روشنی ہے۔ جو قومی جذبات کو ابھارتی ہے اور اخلاق کا روپ سنوارتی ہے۔ اُن کی رُوح میں وطن پرستی کی ایک

تڑپ تھی۔ اُن کے دل میں ایک کسک تھی۔ چنانچہ بجائے عشق و محبت کے رسمی، روایتی ساز پر آہ و بکا کی بوسیدہ دُھنیں الاپنے کے وہ زندگی بھر قوم و وطن کی تانیں اُڑاتے رہے۔ اُن کا ذوقِ سلیم قومی نظموں کے معاملے میں بہت خوب رہا۔ جب اکثر شعراء اپنے ماحول کے پرہول ڈر سے تھر تھر کانپتے ہوئے خوشامد، چاپلوسی اور خودغرضی کی رنگا رنگ پھول مالائیں پروتے ہوئے "خاک کے ذرّوں سے ضیا مانگ رہے تھے" آفتاب اپنے وطن کی حالتِ زار کی پُردرد تصویر پیش کرتے ہوئے دوسرے قومی شعراء کی طرح تحریکِ آزادی کو گرما رہے تھے اور "چاند ستاروں سے ضیا بخش رہے تھے۔" چنانچہ اُن کا شمار ہمیشہ انہیں قوم پرست شعراء میں ہوتا رہا جنہوں نے رات دن تحریکِ آزادی کے حق میں" انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے" اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ؎

" اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی رُوح آزاد ہو۔"

ہریانہ اردو اکادمی کو چاہیے کہ وہ ہریانہ کے اس عظیم سپوت کی تصانیف کو ہریانوی اردو ادب کی آبرو سمجھے اور آفتابؔ کے کلام کا ایک ایسا مجموعہ تیار کرائے جسے کلامِ آفتاب" (۱۹۱۵ء)" سیلابِ اشک" (۱۹۲۱ء)" نغمہ روح" (۱۹۳۱ء)" آفتابِ وطن" (۱۹۳۱ء) "زخمِ وطن" (۱۹۳۴ء)" جذباتِ آفتاب" (۱۹۴۰ء)" جوششِ وطن" (۱۹۴۱ء)" جذبات کی دُنیا" (۱۹۵۵ء)" حبِ وطن" (۱۹۶۱ء) اور "شمشیرِ وطن" (۱۹۶۴ء) کا عطر کہا جا سکے۔ کوئی ایسا مجموعہ ہی آگے چل کر آفتابؔ کے فنی تجزیات کی بنیاد بن سکے گا۔

تحریکِ آزادی

پریم چند کے ابتدائی افسانوں اور ناولوں میں

ڈاکٹر ست پال آنند

پریم چند نے تحریکِ آزادی کے تین ادوار دیکھے ۔ انہوں نے بیسویں صدی کے پہلے برس یعنی ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۶ء میں اپنی موت کے آخری دن تک باقاعدگی سے لکھتے رہے ۔ اس لمبے عرصے میں انہوں نے تیرہ ناول اور لگ بھگ تین سو افسانے لکھے ۔ ان میں سے کئی افسانے اب تک اردو میں شائع نہیں ہوئے حالانکہ پریم چند صدی تقریبات کے سلسلے میں لمبے چوڑے وعدے کیے گئے تھے اور مختلف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے پریم چند کی سب تصنیفات کو اردو میں شایع کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔

۳۶ برس کے اس سفر میں پریم چند نے جو لکھا اس کا اگر بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو اس عہد کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کی صحیح تصویر مل سکتی ہے ۔ ہماری آزادی کی تحریک کے یہ تین ادوار اسی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں۔ یہ تین ادوار ہیں :-

(و) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کی تحریک جس کی رہنمائی کا سہرا مبینہ لال بال اور پال یعنی بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال نے کی۔

(ب) ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی یعنی عدم تعاون کی تحریک ۔ مہاتما گاندھی کی زیر قیادت۔ اور

(ج) ۱۹۳۰ء کا نمک ستیہ گرہ جس کی رہنمائی بھی مہاتما گاندھی نے کی۔

اس مضمون میں صرف پہلے دو ادوار سے متعلق پریم چند کے ادب کا جائزہ لیا جائے گا۔

ان تین ادوار میں منقسم آزادی کی جنگ کا یہ عہد اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں حقیقت پسندی کے شعور کو فروغ ملا اور نتیجتہً حقیقت نگاری اور وطن پرستی کی باہمی ہم آہنگی نے ایسے ادب کو جنم دیا جسے بلاشبہ قومی ادب کہا جاسکتا ہے۔ زبان ذریعۂ اظہار ہے۔ صوبائی زبانوں کے برعکس اردو اور ہندی دونوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بولی اور سمجھی جاسکتی تھیں۔ اردو اور ہندی اس عہد میں شانہ بشانہ عازم سفر ہوئیں اور دونوں زبانوں نے وطن پرستی کے جذبے کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

پریم چند چونکہ اردو اور ہندی دونوں میں لکھتے تھے۔ اس لیے اس بات کا سہرا اوّلین ان کے سر پر بندھتا ہے کہ اس عہد کی سیاسی، سماجی اور نظریاتی تحریکیں اور واقعات ان کے ناولوں اور افسانوں میں اپنا عکس، اپنی پہچان چھوڑتے ہیں اور آج اُنکی موت کے اکیاون برس بعد بھی ہم ان کی تصنیفات کو پڑھ کر اُس دور کی سیاسی اور سماجی تاریخ کو مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر گورکی تصنیفات سے عظیم اکتوبر انقلاب سے پیشتر کی پچاس برسوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے تو پریم چند کی تصنیفات سے بھی تاریخ کے صفحے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

پریم چند نے شعوری طور پر جنگِ آزادی سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ جو ۱۹۰۷ء میں شایع ہوا تھا۔ آزادی کی تحریک کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ اس افسانے کا عنوان تھا۔ دنیا کا سب سے انمول رتن اور افسانے میں یہ رتن اُس خون کے قطرے کو کہا گیا تھا جو وطن کی آزادی کی جنگ میں بہایا گیا ہو۔ یہ افسانہ اُن کے کانپور کے قیام کے دنوں کا ہے اور اس ادبی اور سیاسی شعور کے ارتقا کے پہلے دور کی غمازی کرتا ہے جو ان تین برسوں میں منشی دیا نرائن نگم، اڈیٹر زمانہ کانپور اور پیارے لال شاکر میرٹھی کی صحبت میں گزرے۔ ان تین برسوں میں پریم چند گورنمنٹ

ہائی سکول الہ آباد سے تبدیل ہو کر گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں آ گئے اور منشی دیا نرائن نگم کے ساتھ انہی کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں جب وہ ضلع ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب انسپکٹر ہو کر چلے گئے تو بھی منشی صاحب سے اُن کا تعلق قائم رہا۔ اس دور کے افسانے راجپوتوں کی جوانمردی، وطن پرستی اور شہادت کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے "بکرمادت کا تمغہ"، "آلہا"، "رانی سارندھا" اور ناولٹ "روٹھی رانی" مشہور ہیں۔ جن سے پریم چند کا مقصد یہ تھا کہ وطن پرستوں کی خوابیدہ غیرت کو بیدار کیا جائے اور انہیں احساس دلایا جائے کہ وہ کیسے کیسے جیالے لوگوں کی اولاد ہیں۔ اسی دور میں پریم چند نے اپنے مطالعے کو وسیع کیا اور تبصرے لکھے۔ اب یہ حقیقت روشن ہوئی ہے کہ ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء میں "زمانہ" میں چھپنے والا مستقل کالم "رفتارِ زمانہ" جس میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا۔ پریم چند ہی لکھتے تھے۔ اس کالم کی تحریروں سے اُن کے سیاسی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

پہلے دور کی لڑائی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اُن قوم پرستوں کے ہاتھ میں تھی جو عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ "لال بال پال" کو گرم دل کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ان انقلاب پسندوں نے فرانس کے ۱۷۸۹ء کے انقلاب سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک یورپ میں سیاسی شعور کی بیداری کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے اٹلی کے گیری بالڈی کی سوانح لکھ کر کارلائل کے اس قول کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ "تاریخ سرکردہ رہنماؤں کی سوانح عمریوں کا مرقع ہے" اور اس طرح انگریزوں کی اس گھناؤنی کوشش کا نقاب اتار پھینکا تھا جس کی رُو سے ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں تاریخ کی ایک مسخ شدہ صورت ہی دکھائی جاتی تھی۔ لاجپت رائے اور بپن چندر پال نے تاریخ کو لوگوں کی جدوجہد کی تاریخ سمجھ کر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور یہ کہا کہ تاریخ کے صحیح مطالعے سے ہی ایک محکوم قوم کو عمل کی تحریک ملتی ہے اگر بنکم چندر نے بنگالی میں اور بھارتیندو ہریش چندر نے ہندی میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارنے کے لیے تاریخی کہانیوں کا سہارا لیا تو یہ ایک درست قدم تھا۔ پریم چند

نے اس دور میں راجپوتوں کی بہادری کی داستانیں لکھ کر وہی کام کیا جو بنکم چندر اور بھارتیندو ہریش چندر نے کیا تھا۔ ان کہانیوں میں عدم تشدد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مرنے مارنے کا عزم تھا۔ کٹ مرنے کی تمنا تھی اور وطن کی مٹی سے تلک کرنے اور اپنے خون سے وضو کرنے کی قسم تھی۔ آج بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر نوجوانوں کا خون اُبلنے لگتا ہے۔

"سوزِ وطن" ۱۹۰۹ء میں چھپی۔ یہ کتاب پریم چند کی ذاتی، انفرادی اور عملی جدوجہد کا پہلا پڑاؤ ہے جس نے آگے چل کر وطن کی آزادی کی تحریک کی مجموعی جدوجہد میں شمولیت اختیار کی۔ اس مجموعے میں پانچ کہانیاں تھیں۔ انہی میں "دنیا کا انمول رتن" کہانی بھی ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی خلافِ قانون بات نہیں تھی۔ لاقانونی اور بغاوت پر نوجوانوں کو آمادہ کرنے کے لیے ترغیب بھی نہیں تھی۔ صرف وطن اور وطن کے لوگوں کی زبوں حالی اور کس مپرسی کا بیان تھا۔ تو بھی انگریز حکمرانوں کو ان کہانیوں سے بغاوت کی بو آئی۔ مصنف سے باز پرس ہوئی۔ جھاڑ جھپٹ بھی ہوئی۔ پانچ سو جلدیں تلف کی گئیں۔ ساتھ ہی یہ پابندی بھی لگ گئی کہ آئندہ کوئی بھی تصنیف چھپنے سے پہلے انسپکٹر مدارس سے سنسر کرالیں۔ فراقؔ گورکھپوری لکھتے ہیں:

> "تیس برس ہوئے ان کے پانچ افسانے سوزِ وطن کے نام سے زمانہ پریس میں شایع ہوئے تھے۔ ان کہانیوں میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں ہے وطن پرستی کا شریف جذبہ ان صفحات میں سانس لے رہا ہے۔ یہ کہانیاں نہایت اطمینان سے لڑکے اور لڑکیوں کی درسی کتابوں میں شامل کی جاسکتی ہیں لیکن تیئس برس پہلے کی دنیا اور تھی۔ حکومت نے مصنف سے باز پرس کی۔ میری ان سے ملاقات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے۔ جب انہوں نے صاف اور بے تکلف طرز میں مجھ سے بیان کیا کہ کس طرح انسپکٹر مدارس نے انہیں اپنی تصنیف کی پانچ سو جلدوں کو آگ لگانے پر مجبور کیا۔"

"سوزِ وطن" کی پانچ سو جلدوں کو نذرِ آتش کرنا شاید ایک علامت تھا، آنے والی آگ کی طرف ـــــ جس نے پریم چند سے کئی اور راجپوتی کہانیاں لکھوائیں۔ انہی دنوں

کی یاد تازہ کرنے کے لیے بیس برس بعد بنارسی داس چترویدی کے نام ایک چٹھی میں انہوں نے لکھا۔

"مجھے بُرا تو بہت لگا تھا لیکن کیا کرتا سرکاری ملازم تھا۔ خون کے تو نہیں، صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ لیکن یہ تہیہ کیا کہ اب اگر میرا قلم اُٹھے گا تو ادب اور وطن کی خدمت کا بیڑا اٹھائے گا۔"

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :-

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو بھی یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں۔ لیکن ان کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہو۔"

پھر آگے یہ لکھ کر خط کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں :-

"میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔"

سوز وطن کی مکمل اشاعت کے نذر آتش ہو جانے سے انگریزوں کے خلاف وہ جذبہ جو صرف سُلگ رہا تھا ایک شعلہ بن کر بھڑک اٹھا۔ مدن گوپال کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"سوز وطن کی اشاعت کے قبضے کے بعد پریم چند کے دل میں انگریزوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بار جب نگم نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر کچھ انگریز افسروں کو دعوت دی تو پریم چند نے ایک خط میں لکھا۔ آپ نے انگریز حکام کی دعوت ناحق کی۔ آخر اس سے کیا فائدہ سمجھا؟"

(قلم کا مزدور - پریم چند کی کہانی)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب سوز وطن پر عتاب نازل ہوا، پریم چند مہوبہ میں تھے یہ وہ جگہ تھی جہاں کبھی غیور راجپوتوں کا راج تھا اور آج بھی جہاں، اجپوتی جوہر کی داستانیں

گائی جاتی ہیں۔ یہیں پر ۱۶۸۰ء میں چھتر سال نے مغلوں کی فوجوں سے لوہا لیا تھا اور اپنی مردانگی کا لوہا منوایا تھا۔ اس لیے اگر پریم چند نے اس عہد میں راجپوتی جوانمردی کے کارناموں کی کہانیاں لکھیں تو انہیں وطن پرستی کے جذبے سے بھرپور تحریک آزادی کے لیے علامتی کہانیاں سمجھنا بہتر ہوگا۔ بجائے اس بات کے کہ وہ ہندو مصنف نے "پدرم سلطان بود" کے جذبے کے تحت اپنے آباؤ اجداد کے گن بکھان کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں جیساکہ کچھ ناقدین کا خیال ہے۔

سوز وطن کے افسانے عام قاری کو اب یاد نہیں ہیں۔ ایک افسانہ بعنوان 'عشق دنیا' اور 'حب وطن' اس مجموعہ میں شامل ہے۔ یہ موضوع کے اعتبار سے الگ ہوتے ہوئے مزاج کے اعتبار سے سوز وطن کے دوسرے افسانوں جیسا ہی ہے اس کا پس منظر اٹلی کی تاریخ سے متعلق ہے۔ یہ اٹلی کے سرفروش اور جانباز شہید سپاہی میزینی کی زندگی کے کچھ واقعات پر مبنی ہے جنہیں اکٹھا کرکے افسانے کا روپ دے دیا گیا ہے۔ جیساکہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے اسی عہد میں گیری بالڈی کی تاریخ اور اٹلی کے دوسرے محب وطن سرفروشوں کے کارنامے لکھے تھے۔ عشق دنیا اور حب وطن ۱۸۷۰ء کے ماحول پر استوار ہے۔ اس افسانے کی شان نزول کے سلسلے میں لکھتے ہوئے اپنے ایک خط میں انہوں نے منشی دیا نرائن نگم کو لکھا۔ (۸ مارچ ۱۹۱۰ء)

"جی چاہتا ہے، نئے نئے واقعات پر کچھ نوٹس لکھا کروں مگر واقعات کا علم مجھے اس وقت ہوتا ہے جب اخبارات میں نکل چکے ہوتے ہیں۔ ان میں دیر از وقت ہوجانے کا خوف رہتا ہے۔"

(۲)

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے اپنا ایک ہنگامی اجلاس کلکتہ میں طلب کیا۔ خطبۂ صدارت میں لالہ لاجپت رائے نے واضح لفظوں میں انقلاب کا نعرہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ ملک انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے لیکن ہندوستانی عوام انقلاب کی رفتار سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے قائل ہیں۔ آہستہ آہستہ نہیں چلتے۔ پریم چند

کا ناول "گوشۂ عافیت" انہی دنوں کی پیداوار ہے۔ یہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ذہنی اور طبقاتی کش مکش اپنے عروج پر ہے۔ اس ناول میں دو الگ الگ قسموں کے کسان ہیں۔ ایک وہ جو لڑتے تو ہیں لیکن صرف سمجھوتہ کرنے کے لیے اور دوسرے وہ ہیں جو اپنے حق کے لیے کٹ مرتے ہیں۔ دونوں طرح کے کسان بہرحال جاگیردارانہ نظام سے نالاں ہیں۔ منوہر اس طبقے کا نمائندہ ہے جو اپنے حق کے لیے کلہاڑا اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ اپنے بیٹے بلراج سے مخاطب ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"پرواہ مت کرو۔ کلہاڑا ہاتھ میں لوگے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم میرے بیٹے ہو، تمہارا کلیجہ مضبوط ہے۔ تمہیں اب جو ڈر لگ رہا ہے وہ تاپ سے پہلے کا جاڑا ہے۔ تم نے کلہاڑا کندھے پر رکھا۔ مہابیر کا نام لے کر ادھر چلے تو تمہاری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں گی۔"

زمیندار کے کارندے غوث خاں کے قتل کے بعد جب سارا گاؤں پولیس کی حراست میں آجاتا ہے تو کسان دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کچھ منوہر کے مخالف ہو جاتے ہیں کہ اس کی گرم مزاجی کی وجہ سے گاؤں پر یہ آفت آئی لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اب بھی اُس کے ساتھ ہیں اور پولیس اور دیگر سرکاری ایجنسیوں کی زیادتیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کو بزدلی سمجھتے ہیں لیکن بزدلوں کی تعداد زیادہ ہے اور جب زمیندار نیا کارندہ مقرر کرتا ہے اور یہ نیا کارندہ بھی پہلے کی طرح ثابت ہوتا ہے اور قرقی کا پروانہ لے کر آتا ہے تو سکھو چودھری اُسے روپے دے کر تنبیہ کرتا ہے کہ اب ظلم بند کر دو لیکن نیا کارندہ فیض خاں عدالتی اخراجات کے نام پر اور روپیہ چاہتا ہے! تنگ آکر سکھو چودھری چمٹا اٹھا کر اُس کے سر پر مارتا ہے اور کہتا ہے "یہی عدالت کا خرچہ ہے! جی چاہے تو اور لے لے۔ بے ایمان پاپی کہیں کا۔ کارندہ بنا پھرتا ہے!" اور تب پریم چند لکھتے ہیں۔

"ستیاگرہ میں ظلم کو مغلوب کرنے کی طاقت ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا"

واضح رہے کہ یہ دور کانگریس کے اندر اور کانگریس کے باہر عوام میں زبردست

کشمکش کا ہے جہاں روس کے اشتراکی انقلاب کے بعد کانگریس کے بائیں دھڑے کے انقلاب پسند (جو حقیقتاً اشتراکی نہیں تھے، صرف وطن کی آزادی چاہتے تھے) آزادی کے حصول کے لیے طاقت کے استعمال کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ وہاں گاندھی وادی طرف عدم تشدد پر کاربند رہنا چاہتے تھے "گوشۂ عافیت" میں روس کے اشتراکی انقلاب کا واضح طور پر ذکر ملتا ہے۔ جب منوہر کا بیٹا بلراج جو دنیا کے حالات کی واقفیت رکھتا ہے، باقی کسانوں سے کہتا ہے "ہم کیوں کسی کی دھونس سہیں۔ روس میں کسانوں اور مزدوروں نے اپنا راج قائم کر لیا ہے۔"

یہ بھی واضح رہے کہ کلکتہ کے اس تاریخی اجلاس میں لالہ لاجپت رائے کے دھڑے کی شکست ہوئی اور کانگریس کی باگ ڈور اعتدال پسند لیڈروں کے ہاتھ میں چلی گئی جنہوں نے ستیہ گرہ کا راستہ اپنایا۔

پریم چند کانگریس کے کس دھڑے کی نظریاتی حمایت کرتے تھے اسے سمجھنے کے لیے بھی ہمیں ان کے افسانوں اور ناولوں کے کرداروں کو سمجھنا ہوگا لیکن اس سے پیشتر ہم 'اُس اور بحیل سورس' کو دیکھیں جو ہمیں ان کے میلانِ طبع کے بارے میں براہِ راست بتاتی ہے۔ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں :-

> "پریم چند کا میلانِ طبع گرم دَل کی طرف تھا۔ احمد آباد کانگرس دیکھنے ہم ساتھ ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھہرے لیکن وہ مسٹر تلک کے طرفدار تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور فیروز شاہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث رہتی تھی مگر دونوں اپنی جگہ قائم تھے۔"

آگے لکھتے ہیں :-

> "اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مہاتما گاندھی کی رہنمائی کو نہیں مانتے تھے۔ گاندھی جی کی رہنمائی انہیں بہت عزیز تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور اس کی روشنی میں کسان اور مزدور بھی خوشحال ہو سکیں گے۔"

قطع نظر اس بات کے کہ نگم، امرت رائے اور مدن گوپال نے اُن کے نظریات کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ خود پریم چند نے انگریزی حکومت اور کانگریس کے مابین بات چیت اور جدوجہد کے طویل تر سلسلے کو کس روشنی میں دیکھا۔ ان دنوں جزوی اصلاحات کی گفت و شنید چل رہی تھی۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو اپنے ایک خط میں انھوں نے نگم کو لکھا۔

"میں ریفارم سکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہ ہم سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے۔ حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے۔ اسی طرح آیندہ حاکم بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے۔ اسی طرح آئندہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔"

۱۹۲۰ء میں تلک وفات پا گئے اور تلک جُگ ختم ہوا۔ گاندھی جُگ شروع ہوا۔ گرم دل جس کے حامی پریم چند تھے۔ کانگریس میں پس پشت چلے گئے۔ گاندھی جی نے ذاتی طور پر خلافت کمیٹی سے سمجھوتہ کیا اور کلکتہ کے ستمبر اجلاس سے پہلے ہی ستیاگرہ شروع کر دیا۔ پریم چند پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ گوشۂ عافیت اس اثر کی ایک زندہ دستاویز ہے جسے اگر کانگریس کی باہمی پھوٹ کی تاریخی روشنی میں پڑھا جائے تو بہت گہرے علامتی معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

'گوشۂ عافیت' کے بعد پریم چند میں ایک اہم تبدیلی نظر آتی ہے۔ پریم چند نے 'بازارِ حسن' میں نرم دل کے لیڈر گوپال کرشن گوکھلے کو ڈاکٹر شیام چرن کے کردار میں پیش کیا تھا اور ایسے رہنماؤں پر بھرپور طنز کیا تھا جو ایک طرف تو ملک اور قوم کے غم میں گھلے جاتے ہیں اور دوسری طرف حکام کے ساتھ ڈنر کھاتے تھے۔ برج اور گالف کھیلتے تھے اور وائسرائے کی مشاورتی کونسل کے ممبر ہونے کے ناطے سے لندن سرکاری خرچ پر جاتے تھے لیکن گاندھی جی کے ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان پہنچنے

پر اور ۱۹۲۰ء میں تلک عہد کے خاتمے اور گاندھی عہد کی شروعات کے بعد شاید پریم چند بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ گاندھی جی کا طریقۂ کار کسی حد تک کار آمد اور ثابت ہو سکتا ہے۔

پردہ مجاز ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا ہیرو چکردھر اسی ذہنی کشمکش سے گزرتا ہے۔ جس میں اس دور کا ہر باہمت اور باعمل ہندوستانی نوجوان مبتلا تھا۔ ایک طرف تو چکردھر گوشۂ عافیت کے پریم شنکر کی بولی بولتا ہے اور مادیت اور جدیدیت کا پیروکار ہے۔ کھیت مزدوروں کو بچاتے بچاتے خود زخمی ہو جاتا ہے۔ بے انصافی کو جڑ سے اکھاڑنے کی بات کرتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے گاندھی جی کے ستیاگرہی والنٹیر کی طرح سوچنے لگتا ہے

پریم چند کے الفاظ میں :

"وہ سوچ رہا ہے۔ یہ خونریز ہنگامہ کیوں ہوا۔ میں نے تو بھول کر بھی کسی سے یہ تحریک نہیں کی۔ یہ شاید ہماری اپنی نیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پیغام صلح میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہماری نیت ہوتی تو مخلوق کے دلوں میں راجاؤں پر چڑھ دوڑنے کا جوش ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ جذبات لال بال پال کے نہیں ہیں۔ گاندھی جی اور گوکھلے کے ہیں۔ الفاظ کی تراش بھی گاندھی جی کے کسی خطبے سے لی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں چھپا ہوا یہ ناول ۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۲۱ء کی عدم تعاون کی تحریک کے پس منظر پر لکھا گیا ہے۔ گاندھی ازم کی چھاپ اس ناول کے آخری صفحات پر کلیتاً نظر آتی ہے جب اس کا ہیرو عملی زندگی کو چھوڑ کر سنیاس لے لیتا ہے اور آواگون، روحانیت، اخلاق اور انسانیت کے ربط کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ گاندھی واد کے اس دور میں پریم چند نے عملی زندگی میں کیا کیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ نوکری سے استعفےٰ دیا۔ چرخوں کی دکان کھولی جو چل نہ سکی۔ ڈاکٹر سمپورنانند کے بعد سال ڈیڑھ سال تک " مریادا " کے سمپادک رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سمپورنانند نے جیل سے واپسی پر 'مریادا' کی باگ ڈور خود سنبھال لی تو پریم چند نے نول کشور پریس کے سرپرستی میں 'مادھوری' کا اجرا کیا اور اڑھائی برس تک اس رسالے سے منسلک رہے کچھ مہینے بیکار رہنے کے بعد جنوری ۱۹۳۰ء میں اپنا رسالہ " ہنس " جاری کیا۔ ہنس کی وساطت

سے پریم چند نے اپنی زندگی کے آخری چھ برسوں میں ادب، ملک اور قوم کی جو خدمت کی اُس کی مثال نہیں ملتی وہ کانگریس پارٹی کے ممبر نہیں بنے جبکہ انہیں چار آنہ ممبر بننے کے لیے کئی بار اُکسایا گیا اور نمک ستیاگرہ کے وقت تو عین موقع بھی تھا لیکن شورانی دیوی ممبر بنیں اور جیل بھی گئیں لیکن پریم چند کرم یوگی تھے۔ قلم کے سپاہی تھے، لکھتے رہے۔ نمک ستیاگرہ کی تحریک کے زیر اثر جو کہانیاں انہوں نے لکھیں وہ "سمر یاترا" میں شامل ہیں۔ ان کا ذکر اس مضمون میں ممکن نہیں ہے لیکن ان کہانیوں میں بھی کانگریس سیاست پر تعلیم یافتہ طبقے کی اجارہ داری اور کانگریس کی ELITIST پالیسیوں پر کہیں کہیں نکتہ چینی موجود ہے 'آہوتی' کی ہیروئن روپ منی ایک جگہ کہتی ہے:

" اگر سوراج کے آنے پر بھی جائیداد کی حکمرانی رہے اور تعلیم یافتہ طبقہ یونہی خود غرض بنا رہے تو میں کہوں گی۔ ایسے سوراج کا آنا ہی لعنت ہے... کم سے کم میرے لیے تو سوراج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جاَن کی جگہ گوبند بیٹھ جائے۔"

میں اس مضمون میں میدانِ عمل کے بارے میں بھی بات نہیں کروں گا جو اسی تحریک سے متعلق ہے اس میں بھی تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ ہی تحریک کی رہنمائی کرتے ہیں جو اہنسا کے پجاری ہیں اور گاندھی جی کی تعلیمات پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کا یہ دور یقیناً آنے والے چھ برسوں میں انہیں اس منزل کی طرف لے جانے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ جس کا آخری سنگِ میل 'گودان' اور اس کا کردار ہوری ہے۔ لیکن ــــ میں نہایت ادب سے یہ گذارش کروں گا کہ یہ بھی ایک سنگِ میل ہی تھا۔ پریم چند کی منزل نہیں تھی۔ شاید وہ زندہ رہتے تو منزل سے بھی ہمکنار ہوتے۔

آزادی کی جدوجہد اور

ریاضِ دلربا

ڈاکٹر ابنِ کنول

آزادی کی پہلی جنگ اُس وقت لڑی گئی جب سراج الدولہ نے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور شہید ہوا۔ دوسری جنگ ٹیپو سلطان نے لڑی اور وطن کی حفاظت کے لیے شہادت پائی۔ پھر ۱۸۵۷ء میں دہلی میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا اور بابر اور اکبر کا وارث آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفرؔ گرفتار ہوا۔ آخری اور کامیاب جدوجہد ۱۹۴۷ء کی تھی جس کا نتیجہ ہندوستان کی آزادی کی شکل میں ملا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس عہد میں مغل سلطنت پر زوال آیا ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں غلام ہوا وہی زمانہ اردو زبان و ادب کا سنہری دور گذرا ہے۔ جب سراج الدولہ نے مقابلہ کیا اس وقت شمالی ہند میں اردو شاعری باقاعدہ شروع ہو چکی تھی اور جس وقت ٹیپو سلطان انگریزوں سے لڑ رہا تھا تو میرؔ اور سوداؔ کی شاعری سے در و دیوار گونج رہے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ اردو شاعری کے آسمان پر تارے ٹانک رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے اردو زبان و ادب سن بلوغ کو تجاوز کر چکا تھا۔ تنگ دامانی کی شکایت ختم ہو گئی تھی اور اظہار کے مختلف پیرائے سامنے آگئے تھے۔ انیسویں صدی شاعری کے ساتھ نثر کے ارتقا کی بھی صدی تھی۔ بیشتر نثری داستانیں اسی صدی میں تصنیف ہوئیں اور جدید نثری صنف ناول کی ابتدا بھی اسی صدی میں ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اہلِ ہند کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر غیرتمند

ہندوستانی انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

ایک طرف رہنمایانِ قوم نے اپنی تقریروں اور اخباروں سے عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تو دوسری طرف سپاہیوں نے اپنی زنگ آلود تلواروں کو پھر نیام سے نکالا۔ اس جدوجہد کے دور میں حساس ادیب اور شاعر بھی خاموش نہیں رہا۔ شعرا نے آزادی کے نغمے گائے۔ عوام کو غلامی کا احساس دلاکر آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوکر انگریزوں کے جال وچال سے نکلنے کی ترغیب دی ادیبوں نے مختلف پیرائے اظہار سے عوام پر نہ صرف اس بات کو واضح کیا کہ ہندوستانی قوم دن بدن پستی کی طرف جارہی ہے بلکہ نئے حالات میں زندگی گذارنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے جینے کا سلیقہ بتایا۔ جاگیردارانہ نظام اور جاگیردارانہ ادب کے چنگل سے انھیں نکالنے کی کوشش کی جس کے سبب ہندوستان کو غلامی کی زنجیریں پہننی پڑیں۔

نذیر احمد کے ناول محض ایک طبقہ کی اصلاح کے لیے نہیں تھے بلکہ پوری قوم کی برائیوں کی عکاسی تھی اور آنے والی نئی تہذیب و قوم کی موجودگی میں ملک کی ہونے والی حالت سے آگاہی تھی۔ شررؔ نے تاریخی ناول لکھ کر صرف تاریخی واقعات کو بیان نہیں کیا بلکہ شکست خوردہ قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلاکر غیرت دلائی۔ اور پھر پریم چند تو کھل کر انگریزوں کے مقابلہ پر آگئے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی انگریزوں سے قلم کی لڑائی لڑتے ہوئے گذاردی۔ پریم چند کی لڑائی مہاتما گاندھی اور بھگت سنگھ جیسے رہنما اور مجاہدین کی لڑائی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھائی اور ایسی ظالم اور جابر حکومت سے آزادی کا نعرہ بلند کیا جس میں مزدوروں اور کسانوں کا استحصال ہورہا تھا۔ گوشۂ عافیت، میدانِ عمل، اور چوگانِ ہستی ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں جدوجہد آزادی کے ماحول کو سمیٹ لیا ہے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی اور رہنمایانِ قوم کی طرح اپنا مقصد بھی حصولِ آزادی بنالیا تھا۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفات چھوڑ جاؤں، لیکن ان کا

مقصد بھی حصولِ آزادی ہو"۔

پریم چند کے جن معاصرین نے اس جد وجہد کو آگے بڑھانے میں مدد کی، ان میں سدرشن، سہیل عظیم آبادی، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔

پریم چند کے بعد اردو ناول نگاروں کا ایک ایسا گروپ آیا جس نے پریم چند کی طرح اپنے فن کو حصولِ آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ یہ آزادی صرف سیاسی آزادی نہیں تھی بلکہ سماجی اور معاشی قید وبند سے نجات بھی اُن کا مقصد تھا اور یہ ادیبوں کا وہ گروہ تھا جس نے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ان میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ اہم نام ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اُس عہد میں ہر ادیب اور شاعر جس کے دل میں ملک سے ہمدردی تھی وہ آزادی کی جد وجہد میں شریک تھا۔ اُس نے اپنے طریقۂ اظہار کے ذریعہ آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ اور وہ صرف سیاسی آزادی نہیں چاہتا تھا بلکہ معاشی طور پر بھی قوم کو سربلند دیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستانی عوام کی معاشی بدحالی کا احساس حساس دانشوروں کو اسی وقت ہو گیا تھا جب مغل سلطنت بکھرنے لگی تھی اور انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل ہی ایسی تخلیقات لکھی جانے لگی تھیں جن میں یہ احساس شدّت سے پایا جاتا ہے ایسی ہی تخلیق کا ایک نمونہ ہریانہ کے مصنف منشی گمانی لال کے قصّہ "ریاض دلربا" میں نظر آتا ہے۔

"ریاض دلربا" کا سنہ تصنیف ۱۸۳۲ء ہے۔ دراصل اٹھارھویں صدی ہی میں سیاسی ابتری کے سبب معاشی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ضرورت تھی کہ عوام کو جاگیردارانہ عیش ونشاط کے زوال اور ناپائیداری کا احساس دلا کر محنت ومشقت کے عوض نئی زندگی حاصل کرنے کی طرف رغبت دلائی جائے۔

ریاض دلربا کے مصنف کا مقصد انسان کو اپنی اہمیت اور صلاحیتوں کو محسوس کرانا تھا۔ جاگیردارانہ نظام نے انسان کو آرام طلب زندگی گذارنے کا عادی بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے اپنی انفرادی حیثیت اور اہمیت کھو دی تھی۔ علامہ اقبال

کی پوری کوشش یہی رہی کہ انسان خود کو پہچان لے اور اپنی قوت بازو کے ذریعہ اپنی شناخت کرائے۔ سر سید، حالی اور ان کے دوسرے رفقار کی انتھک کوشش یہ تھی کہ رو بہ زوال قوم علم و ہنر کا سہارا لیکر ترقی کرلے۔ ریاض دلربا کے مصنف نے حالی اور سر سید سے پہلے یہ بات کہی کہ علم و ہنر کی قدر کرو۔ اسی میں ترقی کے راستے ہیں۔ قصہ کے آخر میں مصنف لکھتا ہے:

" معاد کلی اس تمام گفتگو اور حاصل کلام اس افسانہ دلجو سے یہ ہے کہ خداوند تعالی جل شانہٗ نے اس دار ناپائدار میں عقل و ہنر نہایت جوہر شریف و متاع گراں بہا پیدا کیے ہیں اور درستی ہر امر کی اوپر دستیاری و معاونت ان دو جوہر سترگ کے منحصر و موقوف رکھی ہے۔ یعنی جو کام کہ متعلق دنیا کے ہیں بے یاوری علم و خرد کے انصرام نہیں پاتے ...
پس اے دل تو بھی جس قدر کہ ممکن و دست رس ہو باستفادہ علم و ہنر و تہذیب و اخلاق و خرد کی کوشش کر اور صحبت جاہلان سیہ باطن سے کنارہ جو ہو کر پناہ بیج سایہ عاطفت صاحبدلان سراپا تمیز کے لے جا۔"

اس سے پہلے کہ میں "ریاض دلربا" کے موضوع کے بارے میں کچھ کہوں، اس کا مختصراً تعارف کرانا بہتر سمجھتا ہوں۔ "ریاض دلربا" جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ۱۸۳۲ء کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف رہتک کے ایک صوفی بزرگ منشی گمانی لال ہیں۔ کتاب میں مصنف کے بارے میں صرف اتنی عبارت لکھی ہے:-

" مسکین ذرہ مثال گمانی لعل ولد منشی موہن لال کائستھ رامپوری حال وارد قصبہ رہتک نے اس حکایت خجستہ روایت کو بزبان اردو مرقوم اور بہ ریاض دلربا کہ تاریخ اختتام اس داستان رنگین بیان کی ہے ملقب و موسوم کیا۔" (ص۲)

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ منشی گمانی لال کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی
گمانی لال کا تعلق راجہ ٹوڈرمل کے خاندان سے تھا۔ غالب کے شاگرد منشی

ہرگوپال تفتہ ان کے عزیزوں میں سے تھے۔ منشی گمانی لال کے نام سے دو تصانیف وابستہ ہیں۔ ایک "ریاض دلربا" اور دوسری "بھگت مال"۔ بھگت مال میں قصص الانبیاء کی طرح دیوتاؤں کا تذکرہ ہے۔

گذشتہ صدی تک داستان سننے اور سنانے کا کافی رواج تھا بعض دیہاتوں میں آج بھی موجود ہے۔ ان داستانوں کے سننے کا مقصد صرف یہ تھا کہ فرصت کا وقت دلچسپی اور آسانی سے گذر جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ سننے والے یہ بھی چاہتے تھے کہ کچھ دیر کے لیے اپنی زندگی کو بھول جائیں۔ اسی لیے ہر داستان میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے حسن و عشق کی دلفریبیاں مبالغہ کے ساتھ مزے لے کر بیان کی جاتی تھیں۔ ریاض دلربا بھی اگرچہ انیسویں صدی کے اسی ماحول میں لکھی گئی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ نہ اس میں فوق الفطرت عناصر ہیں نہ حُسن و عشق کی وہ رنگینیاں جو داستانوں کا موضوع خاص رہی ہیں۔ نہ میداں داریاں ہیں اور نہ تخیل کی مبالغہ آرائیاں بلکہ ایک عام شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہی بات اس قصہ کی اہمیت کو اور بڑھا دیتی ہے کہ اس کا ہیرو ایک عام آدمی ہے۔ جبکہ اس عہد اور اس سے پہلے لکھے جانے والے تقریباً تمام قصے بادشاہوں اور شاہزادوں ہی کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ریاض دلربا کی کہانی آج کے ناول کی کہانی لگتی ہے یہاں بنیادی مقصد معاملاتِ عشق کو بیان کرنا نہیں، بلکہ معاشی بدحالی کو دور کرنے کے طریقے کو سمجھایا گیا ہے۔ اس کا ہیرو اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے جنگیں نہیں اور نہ کسی دیو یا پری سے مدد لیتا ہے بلکہ محبوبہ کو پانے کے لیے روپے کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور ادعیہ بغیر عقل و ہنر کے حاصل نہیں ہوتا۔ مصنف اپنے ہیرو کی کامیابی پر آخر میں اس طرح لکھتا ہے کہ:

"خیال کیجئے کہ درد کی اوایل حال میں کیا حقیقت تھی آخر کار معاونت دانش و ہنر و رہبری طالع نیک سے ——— فرصت و کمترین مدت میں کس مرتبہ بلند و منصب ارجمند پر فائز ہوا۔"

معاشی کا یہ مسئلہ جو زندگی کے بہت سے معاملات میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے

صرف اس عہد کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ آج کا نوجوان بھی اس میں گھرا ہوا ہے اس لیے یہ کہنے میں مجھے تکلف نہیں کہ "ریاض دلربا" میں محض ایک عہد کے مسائل پیش نہیں کیے گئے بلکہ یہ کہانی آج کی کہانی بھی ہے اس بنیاد پر ناول کو نقش اوّل کہنے میں مجھے جھجھک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کہیں کوئی ایسا عنصر نہیں جس سے اسے داستان کہا جا سکے۔ مسٹر والٹر اسکاٹ نے داستان اور ناول کے فن کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"رومانس (داستان)، نظم یا نثر میں ایک افسانوی بیانیہ ہے جس کی دلچسپی کا انحصار محیر العقل اور غیر معمولی واقعات پر ہوتا ہے ..... ناول اور رومانس سے مختلف فسانوی بیانیہ ہے اس لیے کہ اس میں واقعات معمولی انسانی حالات اور جدید تر سماجی حالات کے اندر واقع ہوتے ہیں"

(THE NOVELIST ON THE NOVEL P.45)

"ریاض دلربا" میں انسانی مشکلات اور سماجی حالات ہی کو موضوع بنایا گیا ہے بلکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی بدحالی کی بھی یہ قصہ بھرپور عکاسی کرتا ہے مغل بادشاہ اور امراء کی آرام طلبی اور عیش کوشی کے سبب ہندوستان پر آہستہ آہستہ برطانیہ کے چالاک اور چُست حکمرانوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بادشاہ کا وجود مذاق بن کر رہ گیا تھا۔ شاطر قوم یعنی انگریز دھیرے دھیرے ہندوستان پر چھا گئے۔ منشی گمانی لال نے اس ناول میں اپنے عہد کے بادشاہوں اور امراء پر طنز کیا ہے۔ دزد کی چالاکی، چستی اور ہنرمندی انگریز قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ اپنی عقل و فراست کے ذریعہ بادشاہ کے محل میں اعلانیہ چوری کرتا ہے اور اسی بادشاہ سے اعلیٰ مرتبہ پاتا ہے جبکہ دزد کے باعث بادشاہ طرح طرح کی ذلت بھی پاتا ہے۔ یہی حالت انیسویں صدی کے حکمرانوں کی انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ "ریاض دلربا" میں کوتوال شہر کی عیاشی اور ذلت اور بادشاہ کے اعلیٰ مرتبت امراء کی دزد کی گرفتاری میں ناکامی اس عہد کے امرا کی عیاشی اور نااہلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں داخلہ بالکل اسی طرح ہوا جیسے "ریاض دلربا" کا ہیرو دزد دربار شاہی

میں اعلیٰ مرتبے پر پہنچا بلکہ حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد پر صادق آتا ہے۔

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

"ریاض دلربا" میں مصنف نے اپنے عہد کے المیے کو پیش کرکے آنے والے اندیشوں سے آگاہ کیا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی کمزوریوں کا پردہ فاش کرکے اس سے آزادی حاصل کرنے کی عوام کو ترغیب دی ہے۔

دراصل اٹھارہویں صدی ہی میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد بادشاہوں کی نااہلی اور عیش پسندی کے سبب ملک کی سیاسی اور تہذیبی حالت بگڑنے لگی تھی اور جس نے آخر میں انگریزوں کی غلامی کی شکل اختیار کی۔ لوگوں نے محسوس کرلیا تھا کہ سیاسی طور پر ہندوستان کی حکومت اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ اب انگریز جیسی چالاک قوم کا مقابلہ کرنا اور آگے بڑھنے سے روکنا دشوار ہے۔ اٹھارہویں صدی کے شعرائے نے ان کمزوریوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے مکتوبات میں اسکی طرف اشارے ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے دیگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔"

ہندوستانی عوام کو اس طرح کی زندگی سے محفوظ رکھنے کے لیے حساس ادیبوں اور شعرا نے اپنے فرض کو نبھایا۔ سیاسی اعتبار سے کمزور ہوجانے کے بعد دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ اپنی قوت کے بل پر جینے کا ڈھنگ آجائے۔ ملک کے اقتصادی حالات ٹھیک ہوں۔ جب تک معاشی طور پر ہندوستان کا عوام خوشحال نہیں ہوگا۔ سیاسی سطح پر ان کی جدوجہد ناکام رہے گی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ حالی اور دوسرے ادیبوں، شاعروں

نے اسی بات پر زور دیا کہ سوسائٹی میں اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے اپنے ہنر پر بھروسہ کیا جائے۔ مہاتما گاندھی کی کھادی کی تحریک بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کو صرف سیاسی طور پر آزادی حاصل نہیں کرنی تھی بلکہ تہذیبی، سماجی اور معاشی آزادی کے ساتھ زندگی گذارنے کے سلیقے کی ضرورت تھی۔ منشی گمانی لال نے بہت پہلے عوام کو اس معاشی بدحالی سے نجات حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ جو بعد میں نذیر احمد، مرزا سجاد حسین، محمد علی طبیب، شرر، راشد الخیری، پریم چند اور دوسرے ناول نگاروں نے کہا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہریانہ میں بذریعہ اردو آزادی کی تحریک کافی پہلے شروع ہو چکی تھی۔

تحریکِ آزادی

اور

اردو ادب

ڈاکٹر چندر شیکھر

تحریکِ آزادی اور اُردو زبان کا اس میں حصّہ دو مختلف عناصر قرار دینا، تحریکِ آزادی کی تاریخ کے ساتھ ناانصافی کا پہلو ہوگی۔ یہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ اگر برطانوی حکومت نے فارسی زبان کو منسوخ کر کے اردو زبان کو فروغ دینے اور ایک طور پر سرکاری زبان بنانے کا ارادہ کیا تو اس سے فارسی زبان کا مستقبل تو ضرور ہندستان میں تاریک ہو گیا مگر اُردو زبان کو جو ترقی ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں حاصل ہوئی وہ شاید دنیا کی کسی زبان کو اتنے کم عرصے میں نہ ہوئی ہوگی۔ تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اگر یورپ میں تعلیم حاصل کر کے انگریزی زبان سیکھ کر ملت کو ایک راہ پر گامزن کیا تو اس قوم اور ملت کو یکجا کرنے کا سہرا اردو زبان کو ہی حاصل ہوتا ہے چونکہ اردو زبان ہندوستان کے تمام لوگوں کی مشترکہ زبان رہی ہے۔ تحریکِ آزادی کی اگر زبان تھی تو وہ دراصل اردو تھی۔

کوئی بھی زبان سماج میں ہو رہی تبدیلیوں سے کبھی الگ ہو کر نہیں رہ پاتی۔ اردو زبان میں بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی ہر دور میں ملتی رہی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو حالات ہندوستان میں رونما ہوئے اور جنھوں نے غیر ملکی قوموں کو یہاں ترقی پانے میں فروغ بخشا وہ اردو زبان کی نظم اور نثر دونوں میں ملتے ہیں۔ غزل شہر آشوب مثنوی قصیدہ۔ قطعات۔ رباعی وغیرہ میں ان خیالات کو رونمائی ہوئی ہے

میر کا شعر ہے:

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

یا سودا کا یہ شعر

ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا
چمن چمن پڑی کرتی ہیں بلبلاں فریاد

اور اس قسم کے ہزارہا شعر اُس انقلابِ دوراں کا شدید احساس اور رنج کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہر انقلاب سے متاثر افراد تین گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ ماحول سے کنارہ کشی کر لیتا ہے اور انفرادی نجات کی فکر میں رہتا ہے۔ دوسرا پہلے سے قطع نظر حیاتی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ تیسرا وہ جو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور عوام کو کسی نہ کسی طرح اس سے باخبر کرتا ہے اس تیسرے گروہ میں ہی اہلِ قلم یورپین قوموں کی آمد ہندوستان میں پندرھویں صدی کے اواخر اور سولھویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔ انگریزوں کی باقاعدہ رہائش ۱۶۲۳ء میں جہانگیر کے فرمان سے سورت میں قائم ہوئی اور رفتہ رفتہ آگرہ احمد آباد بھڑوچ مدراس اور دوسری جانب دکھن کی طرف رجوع کیا۔ جہاں انھوں نے مرہٹوں اور اس علاقہ کی محلی حکومتوں کو مالی امداد دیکر مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کی بادشاہت کا آدھا دوران کو کمزور کرنے میں صرف ہوا جس کے نتائج بہت گہرے اور اس سے شمالی ہندوستان میں بھی انتشار پھیلنے لگا جس کی اصلی صورت اورنگ زیب کی وفات کے بعد پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ جہاں تک اورنگ زیب کے جانشینوں کے کمزور اور عیش پرست ہونے کا تعلق ہے وہ تو ایک امرِ دیگر ہے ان کے علاوہ پورا معاشرہ ایک بدحالی کے دور سے گذر رہا تھا اس کی تصویر ہمیں تاریخ کی مختلف کتابوں میں مثلاً سیر المتاخرین، تاریخ شاکر خانی، آنند رام مخلص کی بدایع وقایع چمنستان درگاہ قلی خاں کی مرقع دہلی، حزیں کا پورا کلیات

اور دیگر شعرا نے اس زمانے کے سماجی حالات کی اچھی عکاسی کی ہے۔

لفظ "آزادی" کا سلسلہ اصل میں اسی دور سے شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں سماج عام طور پر تین گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایک وہ ہے جو حالات کو نظر انداز کر کے صرف اپنے لیے راہِ فرار اختیار کرتا ہے دوسرا وہ جو پہلے سے قطع نظر حیاتی اور جمالیاتی ذوق کی تسکین میں پناہ ڈھونڈتا ہے تیسرا وہ گروہ ہے جو حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور عوام کو کسی نہ کسی طرح اس سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سوداؔ کا یہ شعر اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

سوداؔ جو بے خبر ہے وہ ہی تو عیش
مشکل بہت ہے ان کو جو رکھتے ہیں آگہی

جہاں تک حب الوطنی کا وہ انداز جو کہ ہم آج کے نظریے سے دیکھتے ہیں، ۱۸ ویں صدی میں ہمیں وہ تو نہیں ملتا مگر اس بات کا احساس کہ غیر ملکی ہم پر حاوی ہو رہے ہیں ملک تباہی اور بربادی کی جانب گامزن ہے کثیر تعداد میں دستیاب ہیں بالخصوص شعرا کو اس کا شدید احساس اور رنج تھا۔ سوداؔ نے یہ خوب عکاسی کی ہے۔

تھا ملک جن کا زیر نگیں صاف مٹ گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

دلّی میں انکو بھیک بھی ملتی نہیں ہے آج
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

ولیؔ، سوداؔ، حزیںؔ، خان آرزوؔ کے علاوہ، جن شعرا نے ملک کے انتشار کی عکاسی کی ان میں میرؔ کا نام بہت اہم ہے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلّط پر میرؔ کو بہت شکوہ ہے ان کے استعماری انداز کو انھوں نے بہت تلخی محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے۔

غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کُتّے نے کر کے دلیری صید حرم کو پھاڑا ہے

اور پھر آہ بھرتے ہوئے بے بسی کے انداز میں کہتے ہیں:

یاں سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

بے ثباتی کا عالم پورے ادب پر حاوی ہے شہر آشوب، رباعی، مرثیہ، غزل مثنوی اور نثر میں انشائیہ رقعات مکاتیب تمام کے تمام حالات کی آگاہی دیتے ہیں۔

۱۸ ویں صدی کے نصف اوّل سے جو [illegible] ہیلوں کا ہنگامہ برپا ہوا تو وہ کہیں جا کر پانی پت کی تیسری لڑائی پر ختم ہوا۔ شاہ ولی اللہؒ کے تمام خطوط اور ادبی یا تاریخی مواد سے متعلق اثرات اردو زبان میں ہی زیادہ ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ مرہٹوں کو دبانے کے لیے اور ان سے نجات پانے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حکومت کرنے کی دعوت دی گئی مگر وہ بھی اپنا مقصد حل کر کے واپس چلا گیا۔ شاہ ولی اللہ کا اس کو مدعو کرنے کا مقصد صرف ملک میں پھیلے انتشار کو ختم کرنا تھا۔ ان تمام خطوط اور رقعات سے شاہ ولی اللہ کی حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالنا اور اردو زبان کو فروغ دینا انگریزوں کی ایک دوسری اہم تدبیر تھی جس کے ذریعہ انھوں نے انگریزوں کو اردو داں بنایا اور ہندی اردو زبانوں کا مسئلہ کھڑا کر دیا جس سے عرصے سے چلی آ رہی یکجہتی میں دراڑ پڑ گئی۔ دوسرا ان کا مقصد ہندوؤں کو اپنی جانب کر کے مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی دیواروں کو مزید کمزور کرنا تھا۔ لیکن یہ ایک بڑی مزے دار بات ہے کہ جہاں فارسی زبان کو ہندوؤں میں کم پڑھنا پسند کرتے تھے وہاں اردو زبان کی جانب وہ زیادہ مایل تھے جس کا اندازہ اگر ہم فارسی داں ہندوؤں اور اردو داں ہندوؤں کا مقابلہ کریں تو پتہ چل جاتا ہے۔ حالانکہ فارسی ۸۰۰ سال درباری زبان اور اعلیٰ طبقہ کی زبان رہی مگر اسے وہ مقبولیت محلی ہندوستانیوں میں نہیں حاصل ہو پائی جو کہ اردو زبان نے ایک قلیل مدت میں حاصل کر لی۔

۱۸۰۳ء میں مغل بادشاہت کو مرہٹوں کی دستبرد سے تو نجات مل گئی مگر انگریزوں کی حکمرانی کا طوق ان کے گلے میں ضرور پڑ گیا ظاہری طور پر امن و امان کی صورت قائم ہو گئی۔ ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی سرکار کا تھا۔ لیکن عوام میں اس کے خلاف پھر ایک جذبہ بلند ہونا شروع ہو گیا عظمت رفتہ کا احساس لوگوں کو بے چین کیے ہوئے تھا۔ یہ جذبہ صرف دہلی دربار میں ہی محدود نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں پھیل رہا تھا۔ وہ ریاستیں جنھوں نے مغل بادشاہت سے آزاد ہو کر انگریزوں کے ہاں پناہ لی تھی اور انگریزوں نے ان کو فوجی امداد کے نام پر اپنے چُنگل میں جکڑا تھا اب ان کو بھی اپنے حال پر پشیمانی تھی۔ اس صورت حال میں اردو شاعری نے بہترین شاعر پیدا کیے جن کا جواب اور مدمقابل پورے اردو ادب میں نہ مل سکا۔ ان میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ اور خود بہادر شاہ ظفرؔ شعرا کی فہرست میں چہار چوب کا مقام رکھتے ہیں۔ پوری بادشاہت کا نقشہ ظفرؔ کے ان شعروں سے دکھائی دے جاتا ہے۔

باغِ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط
اے ظفرؔ چلتی ہوا یاں دمبدم ہے مختلف

جوں بوئے گل رفیقِ نسیمِ چمن ہیں ہم
اے ہمدمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

اعتبار صبر و طاقت خاک رکھوں اے ظفرؔ
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

اور غالبؔ سے قبل از جنگ آزادی سنیے،

یہ گلزار اب ہو گیا خار زار
خزاں ہو گئی ہائے اس کی بہار

گدائی کا کاسہ لیے در بدر
ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر

مختصر یہ کہ شعرا کا کلام ایسے مضامین سے پُر ہے اس کے برعکس افسانوی ادب کم و بیش ابھی پرانے ڈھانچے پر ہی قایم تھا صوفی حضرات کے ہاں ضرور غیر ملکی افراد سے آزادی حاصل کرنے کی تبلیغ شروع ہو چکی تھی جس کا اندازہ ہمیں اُس دور کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے ان میں دہلی کے صوفیوں کے علاوہ ہریانہ کے نارنول اور ہانسی اور پانی پت کی درگاہوں میں مقیم علماء نے اہم رول ادا کیا ہے حالانکہ ان کے ملفوظات میں ظاہری انداز احیائے اسلام کی بات ہے مگر پس پردہ انگریزوں سے ملک کو نجات دلانا ہے اور یہ بات واضح بھی ہے کہ اُس دور میں آزادی کے وہ معنی عوام میں پیدا نہیں ہوئے تھے جو کہ آگے چل کر ہو گئے یا جس کا تصور ہم آج کرتے ہیں لیکن لیکن اس آزادی کی بنیاد اُسی آزادی کی روش پر قایم ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں شکست کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں مگر یہ قطعی آشکارا ہے کہ ہندوستانی عوام میں آزادی حاصل کرنے کی جانب ایک بیداری آرہی تھی۔ جنگِ آزادی کے وقت کے بیشتر اشتہار، فرامین، خطوط، رقعات اور فتوے اردو زبان میں تھے ان میں سے بیشتر زمانے کی گردش میں تہِ خاک ہو گئے یا برطانوی حکومت نے اسے ایک بغاوت قرار دینے کی سازش کے تحت برباد کروا دیا۔ تاہم کچھ فرامین اور خطوط ابھی دستیاب ہیں ان میں سے ایک فرمان جو نانا صاحب کا تھا اس طرح ہے جس سے ان کے جنگ آزادی کے جذبے کا پتہ چلتا ہے۔

"جان یک روز کبھی جائے گی پر اس طرح عزت کھو کر کیوں مرنا ہم سے
لڑائی فساد جنگ جو کچھ ہوگا سو تلوار سے ہوگا تاکہ عزت سے جی سکیں۔"

اس سلسلے میں جہاد فتویٰ جو کہ ۱۸۵۷ء میں جامع مسجد حضرت رسول نُما کی درگاہ سے جاری ہوا بہت اہم ہے یہ بعد میں اخبار الظفر دہلی میں شایع ہوا۔ دہلی کے سپاہیوں کا اعلان کچھ اس طرح تھا۔

"اب یہ لازم ہے کہ رعایا اور فوج ہر مقام کی ایک دل ہو کر ہمت کریں، تخم ان کافروں کا باقی نہ رکھیں ..... اور جہاں تک ہو سکے نقل اس اشتہار کی ہر مقام پر روانہ کرنا لازم ہے..... اشتہار کی مشتہر کرنے میں بہت احتیاط لازم ہے"

حالانکہ یہ اشتہار بھوپال میں پکڑا گیا مگر اس سے واضح ہے کہ اردو زبان کا یہ اشتہار کتنی جگہ کارآمد ثابت ہوا مراد یہ کہ قبل از جنگ تمام مہم کا دارو مدار اردو زبان پر مشتمل تھا۔

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد کے بہت سی دستاویزات جو کہ PAPERS OF '57 کے نام سے جانے جاتے ہیں مختلف سٹیٹ آرکاویز ڈپارٹمنٹوں میں محفوظ ہیں۔ ہریانہ آرکاویز میں اچھا خاصا مواد اس کے متعلق موجود ہے جس کا عنوان 'حالات صوبہ دہلی' ہے اس میں ۱۸۱۵ء سے لیکر ۱۹۰۵ء تک کے (ہریانہ) مراد اس دور کے صوبہ دہلی سے متعلق کاغذات یکجا ہیں۔

تحریکِ آزادی یعنی پہلی جنگ آزادی سے متعلق برطانوی حکومت کے اعلانات قلمی اور شایع شدہ دونوں اردو زبان میں موجود ہیں ان میں دو چیزیں سب سے اہم ہیں۔ ایک قلمی نسخہ تاریخ جھجر کا ہے جس میں نواب عبدالرحمٰن خاں کا پہلی جنگ آزادی میں حصہ منعکس کیا گیا ہے سر میٹکاف کو پناہ نہ دینے کے جرم میں اسے دہلی کے گھنٹہ گھر کے پاس پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہ تمام حالات اس قلمی نسخہ میں درج ہیں اس کے علاوہ ایک دوسری اہم لسٹ جس کے صفحات کی تعداد ۲۵ ہے اس میں برطانوی حکومت کے ذریعہ مجرم قرار دیے گئے لوگوں کے نام درج ہیں۔ دہلی کے گلی کوچوں سے گرفتار شدہ افراد کے علاوہ ہریانہ بلب گڑھ، بہادر گڑھ، گوڑگانواں، روہتک، فرید آباد، میوات پانی پت اور سونی پت کے لوگوں کے نام درج ہیں۔ اس فہرست میں ان لوگوں کے نام کے علاوہ ان کا پیشہ، تنخواہ اور جرم تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تین صفحات پر مشتمل ایک اور اردو زبان میں تحریر شدہ اعلان ہے جس کے مطابق ملکہ انگلستان نے عام معافی

کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان میں عام معافی کے علاوہ جو مضمون درج ہے وہ اس جنگِ آزادی کو ایک بغاوت کا عنوان دینا ہے۔ اس کے علاوہ بلب گڑھ۔ جھجر۔ کنجپورہ ریاستوں کے نوابوں کی وہ اسناد بھی شامل ہیں جن میں ان کا پہلی جنگِ عظیم میں کس قسم کا اشتراک رہا۔ بلکہ اس ضمن میں چنڈی گڑھ میں مقیم تاریخ و ادب کے محققین سے گذارش کروں گا اس پورے ریکارڈ کی روشنی تحریک آزادی کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جائے۔ اس کے بعد انگریزوں کے ظلم کی داستان بھی اہلِ قلم کے سینہ میں دبی نہ رہ سکی۔ غالبؔ کے خطوط اس بارے میں کتنے مددگار ثابت ہوتے ہیں دیکھئے۔

عبدالغفور کو لکھتے ہیں :

" میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں بعد گھڑی کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں "

انگریزوں نے نہ صرف ظلم ڈھائے بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ہندو مسلم بھائیوں میں کھائی پیدا کر دی۔

غالب اپنے دوست ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے ..... ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔

اس امر کو انگریزوں نے مزید ایسی کتابیں شایع کر کے پھیلایا۔ ان میں دو ڈائریاں پہلی ۱۸۵۷ء سے قبل پہاڑ گنج میں پوسٹڈ ایک کوتوال معین الدین کی اور دوسری منشی جیون لال کی تھی اس میں انھوں نے دہلی کا جو نقشہ کھینچا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کے دہلی تک آنے سے قبل ہی افراتفری کا عالم چھا چکا تھا اس کو میٹکاف کے لڑکے نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

بہر حال اس ناکامی کے بعد ایک سلسلہ بہت عقلمند اور پڑھے لکھے طبقے نے شروع کیا جس کا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں یہ احساس آ رہا تھا کہ پہلی جنگ آزادی جسے

بغاوت کا نام دیا جا رہا تھا وہ محض مسلمانوں کے اشارے پر کی گئی تھی اور وہ اس میں سب سے زیادہ ظلم کے شکار ہوئے۔ ان کی اصلاح کے لیے سرسید احمد کی علیگڑھ تحریک نے اردو زبان و ادب کا احیا، مسلمانوں کو پستی سے ابھارنے، ملک کو اس کی عظمت رفتہ واپس دلانے کا کام ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ آزادی کی جنگ پھر سے چھیڑنے کا علم اٹھایا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض رجعت پسند عناصر نے ان کی اصلاحی تحریک کو غلط نظریوں سے تعبیر کیا جس کو میں یہاں نہیں چھیڑ رہا ہوں۔ بہر حال ان کے پیرو کاروں میں پانی پت کی عظیم شخصیت حالیؔ پانی پتی بھی ہیں جن کے نام گرامی کی وجہ سے یہ اردو اکادمی وجود میں آئی۔ انھوں نے سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر حب الوطنی کی شاعری کا آغاز کیا ان کی پوری شاعری میں عشقیہ یا جمالیاتی انداز کے شعر نا ہونے کے برابر ہیں جبکہ وطن دوستی اور اسے غیر ملکی افراد کے چنگل سے نکالنے کی مہم ہے۔ ان کی ہر نظم قومی و سیاسی رنگ کی عکاسی کرتی ہے۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

پھر کہتے ہیں:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

اور نصیحت کرتے ہیں

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنہیں

قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں

قدر آزادی کی جتنی ہم سے ہو اتنی ہے کم

اور مسدس حالی ایسے اشعار سے پر ہے ان کے علاوہ شبلی نعمانی، اسمٰعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد نے اس تحریک میں اہم رول ادا کیا۔ اور اس تحریک سے سب سے موثر اثر یہ ہوا کہ اس نے اردو نظم و نثر کو اس کے روایتی انداز سے نکال کر معاشرہ کی عکاسی اور راہنما قرار دیا۔ اس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال جیسے شاعر نے پوری قوم کو بیدار کرنے کا عزم کیا اور ہر شعر میں انگریزوں کے مدمقابل ہوئے۔

بہر حال مختصر یہ کہ ۱۹ صدی کے نصفِ آخر تک تحریک آزادی میں اردو زبان نے ابلاغی حربہ کی شکل میں کام کیا اور عوام کو آزادی کے معنی بتائے۔

آزادیٔ وطن میں

میواتی ادب کا حصّہ

حکیم اجمل خاں

اِت دلی اُت آگرو جے پُر اور بیراٹھ
کالو پہاڑ سہاونو جہاں بسے میوات

شہاب الدین غوری کے عہد میں علاقہ میوات کا یہی جغرافیائی حدود اربعہ تھا جسے ایک میواتی شاعر نے مندرجہ شعر میں بیان کیا ہے۔ اس علاقے کی حدود اگرچہ سیاسی عوامل کی وجہ سے اب سکڑ گئی ہیں۔ مگر پھر بھی راجستھان کے جے پور' الور' بھرت پور' یوپی کے متھرا اور ہریانہ کے فرید آباد و گوڑ گاؤں میں کثیر التعداد میو آباد ہیں جن کی وجہ سے اس علاقے کو میوات کہا جاتا ہے۔ میوات کی کچھ اپنی روایات ہیں اور جدا تہذیب و کلچر ہے جس سے ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں اور نسلوں سے ممتاز کرتی ہیں اور اس کی اپنی بولی بھی ہے جسے میواتی کہا جاتا ہے۔

میواتی ادبیات میں نثر کم نظم زیادہ ہے جو بات' دوہا' کہد' برہیڑا' جس اور جُگس پر مشتمل ہے' پھر کہاوتیں اور پہیلیاں بھی ہیں۔ ڈھولا' ہولی' گیت اور رتوائی بھی ہیں جو کسی کتاب میں نہیں بس سینوں میں محفوظ ہیں اور وقتاً فوقتاً گائی جاتی ہیں۔

میواتی کی کلاسیکل نظم سعد اللہ خاں کی کیرٹری کی مہابھارت ہے جو میواتی کی رزمیہ کہانی ہے اور میوات میں پانڈوؤں کے کڑے" کے نام سے مشہور ہے' اور یہی رزمیہ نظم میو قوم کے کیرکٹر کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی رزمیہ نظمیں

میواتی میں موجود ہیں جنہیں میو قوم کے میراثی اکثر و بیشتر میو تقریبات میں گاتے ہیں مگر جو حیثیت مہابھارت کو حاصل ہے وہ کسی اور نظم کو نہیں۔

جہاں تک ہندوستان کی آزادی میواتی ادب کی ساجھے داری کا تعلق ہے اس کا زیادہ تر حصہ تو ضائع ہو چکا ہے مگر پھر بھی کافی میواتی اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ میواتی ادب کو ہندوستان کی آزادی میں غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔

میو قوم کا مرکزی کردار حب الوطنی، حریت پسندی، جاں نثاری اور وفاشعاری رہا ہے جو اسے اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا ہے وہ ہندوستان کے پایۂ تخت دلی، جس کی راجدھانی گڈھ دھامینہ تھی اور جو اب مہرولی کے کھنڈرات میں گم ہو چکی ہے کی حفاظت کرتے رہے۔

"جب تب دلی تو مر گی"

اور

کہہ کر بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ تاریخ فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی، طبقات ناصری اس بات کی شاہد ہیں کہ میوؤں نے شہاب الدین غوری، شمس الدین التمش، قطب الدین ایبک، غیاث الدین بلبن، فیروز شاہ تغلق، ظہیر الدین بابر اور جلال الدین اکبر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ اتفاق کی بات تھی کہ میوات اور گجرات دلی کے قریب تر تھے۔ اس لیے ہر بیرونی حملہ آور کا ان دونوں علاقوں میں بسنے والوں سے مقابلہ ناگزیر تھا۔ اسی لیے یہ دونوں علاقے تباہ و برباد ہوئے، مگر دلی کے لیے ہمیشہ ڈھال بنے رہے۔ ہنیڑی، جو میواتی کے ساتھ ملتی جلتی راجستھانی بولی ہے، کے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

نپ جے جودھا مرگھنا ایک بات سو بات کی
دلی کاندھے ڈھال کی دھینگ دھرا میوات کی

غیاث الدین بلبن نے ایک لاکھ میو قتل کرائے اس نے ایک میو کا سر لانے پر ایک ٹنکہ سکہ رائج الوقت انعام مقرر کر رکھا تھا، بعض مورخین بابر اور اکبر کے مقابلے میں رانا سانگا اور مہارانا پرتاپ کا نام بڑے فخر سے لیتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں ہستیوں نے بہادرانہ کارنامے انجام دیئے ہیں مگر یہ حقیقت بھی یاد رکھ لینے

کی ہے کہ ظہیر الدین بابر کا مقابلہ میووں نے پانی پت ہی سے شروع کر دیا تھا اور راجہ حسن خاں میواتی کے بیٹے کو بابر نے یہیں یرغمال بنالیا تھا اور پھر بابر نے اس لڑکے کو زندہ رہا کرنے اور اسلام کا حوالہ دے کر حسن خاں کو مقابلے سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اسے کامیابی نہ ملی اور حسن خاں میواتی نے بارہ ہزار میو فوجیوں کو لیکر فتح پور سیکری میں بابر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جہاں حسن خاں میواتی اور بارہ ہزار میو فوج کام آئی تھی۔

اسی طرح اکبر کے راج کو بھی میووں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا جس کی شہادت میواتی کے اس دوہے سے برابر ملتی ہے۔

پانچ پہاڑ کی راجنائی اور پورو میرو دل
آدھے اکبر بادشاہ آدھے پاہٹ ٹوڈر مل

ایک اور میو سردار نے شہنشاہ دلی کی طلبی پر اس کے قاصد کو مندرجہ ذیل جواب لکھ دیا تھا۔

تو دلی کو بادشاہ ہم پاٹن کے راؤ
تیری دلی ملنے نا چلوں، میری پاٹن ملن آؤ

مگر عام طور پر تحریک آزادی ہند کو ۱۸۵۷ء سے شمار کیا جاتا ہے آزادی کی اس پہلی جدوجہد میں میوات اور اس کے آس پاس کا کوئی محاذ ایسا نہ تھا جس پر میووں نے لڑائی نہ لڑی ہو۔

بھونڈسی گوڑگانوہ کے قریب راسینہ گاؤں میں، جو دھنگل میووں کا گاؤں ہے، اور امراوتی پربت کے دامن میں واقع ہے، انگریزی فوج کے ساتھ گھمسان کی جنگ ہوئی، جو میوات میں ۱۸۵۷ء کی مشہور جنگ شمار کی جاتی ہے۔ اس جنگ کا پورا حال میواتی شاعر نے "راسینہ کی بات" میں کہا ہے جسے میواتی میراثی اکثر گاتے رہتے ہیں۔ اسی بات کا ایک شعر آپ ملاحظہ فرمائیں۔

بنگلہ میں من نا لگے سونی دیکھاں سیج
راسینہ کا گور میں دیکھا بنا سیس انگریج

انگریزی عمل داری کے بعد راسینہ اور اس کے آس پاس کے دیہات ضبط کر لیے گئے اور وہاں کے زمینداروں کے مالکانہ حقوق ہمیشہ کے لیے سلب کر لیے گئے، یہ گاؤں ہیں:

راسینہ، ہرچند پور، سانپ کی نگلی، نوزیرہ، ہریا ہیڑہ
محمد پور، بانی کی، ہر متھلہ اور فیروز پور جھرکا میں دوہا۔

مگر نوح میں اس سے بھی بڑا ظلم ہوا۔ وہاں نلہڑ اور ڈونڈا ہیڑی دو گاؤں کی زمین ضبط کر کے چغل خوروں کو انعام میں دے دی اور مالکان کو انگریز دشمنی کی پاداش میں پھانسی دے، اور ان کی اولادوں کو ہمیشہ کے لیے جائداد سے محروم کر دیا۔

راسینے کے علاوہ گھاسیڑ کے محاذ پر ایک ہزار، روپڑاکا میں چار سو، اور جوراسی میں ۸۰ آدمی کام آئے، نیز نوح میں باون سربرآوردہ اشخاص کو پھانسی دی گئی اور اِدھر اُدھر جو میو مارے گئے ان کا تو کوئی شمار قطار نہیں۔

انگریز سرکار گاہے گاہے رجواڑوں کی مدد سے بھی مجاہدینِ آزادی کی سرکوبی کرتی رہتی تھی، چنانچہ دو مشہور میوؤں گھرچڑی اور میو خاں نے الور دہلی کے درمیان ٹیلیگراف لائن کاٹ دی تو مہاراجہ منگل سنگھ والیِ الور نے انگریزوں سے اپنی بے بسی کی شکایت کی۔

بھوپ ہیا چونڈا دَتے کاٹو انگریجن کو تار
منگل سنگھ بے بس ہیو، کری دتی جار پکار

انگریزی عملداری کے بعد بھونڈسی میں پولیس لائن قائم کر دی گئی تھی، جو آنے جانے والوں کو پریشان کرتی اور عورتوں تک کی توہین کرتی، اس زمانے میں سلم اور مسلم دو بھائی اٹاوڑ گاؤں کے رہنے والے تھے، جب انہیں اس پولیس لائن کی اطلاع ملی تب انہوں نے اسے توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ جسے میواتی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے

سلم سو مسلم کہے سُن میرا بھائی
چل کے توڑاں لین کو پھر کد جنے گی مائی

ان دونوں بھائیوں نے بھونڈسی جاکر پولیس کو بھگایا جس پر میو شاعر نے کہا۔

اٹاوڑ کے او نہڑہ کدی نہ جانا روک
نگر اٹاوڑ گاؤں نے لین کری موکوف

کانگریس پلیٹ فارم سے جب جدوجہد آزادی کا دوسرا دور شروع ہوا تب اس میں بھی میواتی عوام پیچھے نہیں رہے۔ اس زمانے میں عورتوں اور بچیوں کی زبان پر یہ گانا اکثر سُنا جاتا۔

کسی جائیگو پھرنگی یا رج میں سُو
یعنی فرنگی یہاں سے ضرور جائے گا

لارڈ کیننگ نے اپنی سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے۔

کہ میوؤں نے مسلمان بادشاہوں کو تو تنگ کیا ہی تھا مگر ہمیں بھی بہت پریشان کیا ہے۔

انگریز کے ساتھ تمام مڈبھیڑوں کا میواتی شاعری میں تذکرہ ضرور ہوتا تھا اور شعراء بڑی مستعدی سے واقعات کو نظم کر لیتے تھے مگر وہ سب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ضائع ہوتا رہا اور اگر کچھ بچا کھچا تھا تو ۱۹۴۷ء کی نذر ہو گیا۔

میواتی ادب کے علاوہ میوات کے اردو نثر نگاروں اور شعرا نے بھی جدوجہدِ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس کا تذکرہ بھی اگر ضمناً کر دیا جائے تو مضائقہ نہ ہو گا۔

علاقہ میوات کا غالب حصہ چونکہ پنجاب میں واقع تھا اور یہاں یونینسٹ وزارت قائم تھی جو انگریزوں کی ٹوڈی پارٹی کہلاتی تھی، اس لیے دیہات میں کانگریس تحریک کا نفوذ بہت مشکل تھا۔ پھر بھی میوات میں کانگریس متھرا اور آگرہ کے راستے سے داخل ہوئی۔ حکیم برج لال متھرا اور کشن لال جی اسے یہاں لیکر آئے تھے، جسے پہلے ہی قبول کرنے والے ڈاکٹر کنور محمد اشرف، سید مطلبی فریدی اور چودھری عبدالحئی صاحب تھے۔ میوات میں سب سے پہلے فیروز پور جھرکا میں کانگریس کمیٹی قائم ہوئی جہاں چند کارکنوں کو سرکار نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر آس پاس کے میو دیہاتی لاٹھیاں اور برچھیاں لے کر تھانے

پر چڑھ گئے تھے تاکہ ورکروں کو آزاد کرایا جاسکے مگر پولیس نے فائرنگ کردی جس میں کئی آدمی مارے گئے۔

اس کے علاوہ میوات کے بڑے دیہات 'سنگار' بیدر، گھاسیڑہ، الی میو، مالپر، شکراوہ، گرنہاڈلی، پوناہانہ میں بھی کانگریس کمیٹیاں قائم ہوئیں۔

ادھر الور میں کسان تحریک اور بھرت پور میں پرجا منڈل تحریک شروع ہوچکی تھی ان دونوں تحریکوں کے لیڈران بھی برابر میوات میں آنے لگے اور بھرت پور سے خاص طور پر ماسٹر آدتیندر، شری راج بہادر، پنڈت سانول رام، پنڈت جگل کشور، کانگریس لیڈران آتے تھے، اسی طرح ہریانہ سے پنڈت نیکی رام شرما اور پنڈت سری رام شرما، روپ لال مہتہ ہری ہر لال بھارگو، آنے لگے۔ دہلی سے سجاد ظہیر اور صاحبزادہ محمود الظفر دورہ کرنے لگے۔ مگر ان تمام حضرات میں شاعر کم مقرر زیادہ تھے اور اکثریت باہر کے لوگوں کی تھی۔

البتہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف، سید مطلبی فرید آبادی، خورشید فرید آبادی، رحیم خاں بکن پوری غلام سرور ساکر سوسی، باسم میواتی، مولانا داؤد راز برج، اردو اور میواتی کے ادیب و شاعر تھے اور اسی علاقے کے رہنے والے بھی۔

ڈاکٹر کنور محمد اشرف کی تعلیم چونکہ جامعہ ملیہ دہلی اور علی گڑھ یونیورسٹی کی تھی، اس لیے انہیں اردو میں مہارت تھی، وہ یہاں اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ تحریک آزادی کی خدمت کرتے رہے اور میوات کے عوام پر چھائے رہے۔ کانگریسی ورکروں کی کمانڈ بھی انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران بہت سے اشتہار اور کتابچے مرتب کیے۔ پھر دہلی سے اخبار نیا دور بھی شروع کیا جو آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔

سید مطلبی فرید آبادی سیاسی مقرر تو تھے ہی، مگر ان کے دو شعری مجموعے بھی تھے برکھارت اور پنہاری، جو اب نایاب ہیں اور انقلابی کم ادبی زیادہ تھے، جیساکہ ان کے نام سے بھی ظاہر ہے۔ خورشید فرید آبادی کا کلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ صاحب کانگریس ورکر تھے اور شاعر بھی!

اسی طرح رحیم خاں تمکن پوری میواتی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا مطبوعہ کلام اب دستیاب نہیں! ممکن ہے پاکستان میں ملتا ہو، غلام سرور ساکر سوی کی ایک بڑی مشہور نظم

"جوانانِ وطن للّٰلہ اب بیدار ہو جاؤ"

تھی، جو ہمارے قومی اخبار "آفتاب میوات" میں شائع ہوئی تھی، اسی طرح باسم میواتی کی نظمیں بھی آفتاب میوات میں آتی تھیں۔ وطن، قومیت اور اتحاد ان کی نظموں کا موضوع ہوتا تھا۔ یہ بھی پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری کا کوئی مطبوعہ بھی نہیں ملتا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ ان کی ایک نظم

قوم کی روح رواں ہے اتحاد
شادمانی کا جہاں ہے اتحاد

کی زمین پر تھی، جو خاصی لمبی بھی تھی، اپنے بچپن میں ہم اسے یاد کر کے سناتے تھے۔ مولانا داؤد راز بہت مشہور شاعر تھے، وہ مذہبی بھی تھے اور قومی بھی، ان کا ایک شعری مجموعہ تو اصلاح الرسوم تھا، جو انہوں نے اہلِ میوات کی غلط رسومات و عادات کی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ پیام زندگی ہے، جو اب بھی ملتا ہے ان کی دو مشہور نظمیں میوات میں بے حد مقبول ہیں۔

ایک — مری پیاری میوات میرا وطن ہے

اور دوسری — گواہ گنگ اس کی تو شاہد جمن ہے
یہ ہندوستاں میرا پیارا وطن ہے

آخر الذکر نظم ان کی کتاب پیام زندگی میں موجود ہے۔

میرے والد محترم حکیم عبدالشکور مرحوم شاعر نہیں نثر نگار تھے اور مصلح و مفکر بھی! انہوں نے ۱۹۲۶ء میں آفتابِ میوات کے نام سے اخبار نکالا، جو ۱۹۴۵ء تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ پھر تنقید، تاریخ میوات، اصلاح میوات، اصلاح

میوان، پیام آزادی، کے نام سے کتابیں اور پمفلٹ بھی شائع کیے۔ ان کا دائرۂ کار بالعموم میوات تھا، ڈاکٹر اشرف، سید مطلبی فرید آبادی، چودھری عبد الحئی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ، مولانا ظفر علی خاں سے ان کے مراسم و روابط تھے مگر ان کا میدان سیاست کم، اصلاح و تعلیم زیادہ تھا، اس لیے جو کچھ لکھا وہ انہوں نے نثر ہی میں لکھا اور ان پر آفتاب میوات میں شائع کیا،

یہ ایک مختصر سی روداد ہے، میواتی اور اردو ادب کے میوات میں تحریک آزادی کی خدمت کرنے کی!

اس عنوان پر اگر محنت سے کام کیا جائے تو اور چیزیں بھی سامنے آسکتی ہیں۔

آخر میں اپنے اس مضمون کو ایک میواتی شعر پر ختم کر رہا ہوں، جسے ایک میواتی شاعرہ نے آزادی ہند کے سپہ سالار مہاتما گاندھی کی شہادت پر کہا تھا۔

بھروسو اٹھ گو میون کو
گولی باپو کے لگی ہے چھاتی بیچ
یا کو ناری بھی رووان بالک بی رووان
بوڑھا بی رووان ستھرٹی کے بیچ
بھروسو اٹھ گو میون کو
گولی باپو کے لگی ہے چھاتی بیچ

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں

اردو طنز و مزاح کا حصّہ

رام لال نابھوی

آزادی کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک مثال دیکھیے۔ کسی پرندے کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیں۔ اسے بادام کھلائیں۔ چوری کھلائیں۔ دیکھ بھال کریں۔ اس سے اُنس پیدا کریں۔ لیکن اس کے پر پنجرے میں پھڑپھڑاتے رہیں گے۔ قدرت نے اسے کھُلی فضا میں اڑنے کے لیے پر دیئے ہیں۔ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ پرندہ بے زبان ہے۔ طاقتور نہیں۔ ورنہ وہ قفس کی تیلیاں توڑ کر اڑ جاتا۔ اب اگر اسے پنجرے کی کھڑکی کھلی مل جائے تو وہ آنکھ جھپکنے میں نکل اڑیگا۔ انسان کو قدرت نے عقلِ سلیم عطا کی ہے۔ طاقت دی ہے زبان دی ہے۔ وہ کسی کا غلام رہنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی یہی ہے۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

طنز و مزاح کے مظاہر تبسّم۔ ہنسی۔ قہقہہ۔ پیروڈی۔ تحریف۔ رمز۔ ہزل۔ لطیفہ۔ پھبتی۔ تضحیک۔ تنقیص۔ تمسخر۔ استہزا۔ خمریات۔ بھکڑپن۔ فحاشی۔ ریختی۔ ضلع جگت۔ نغز وغیرہ ہیں۔ جب فنکار مظاہرِ حیات پر نظر ڈالتا ہے۔ مشاغلِ کائنات پر غور کرتا ہے۔ معاشرہ کی خامیوں اور خرابیوں کو گرفت میں لیتا ہے۔ تو اسے کوئی بات مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ کوئی المیہ۔ کوئی طربیہ۔ کوئی نفرت انگیز۔ کوئی حیرت انگیز۔ کہیں سیاسی اور مجلسی ناہمواریاں ہیں۔ کہیں سماجی بدنظمی۔ قنوطیت اور ماحول کے نت نئے قواعد و ضوابط ہیں۔ کہیں آزادی کی سخت کوشی پر غلامی کی تن آسانی ہے۔ کہیں مذہبی پابندیاں ہیں۔ کہیں زبان اور بیان پر تالے لگے ہوتے ہیں۔ شاعر اور ادیب حسّاس طبیعت کے

انسان ہوتے ہیں۔ اس لیے کبھی وہ مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں اور کبھی طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو کچھ کہا گیا وہ داستان ایک سو سال سے اوپر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر مقالے میں سب کچھ یا بہت کچھ قید نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸۳۲ء میں مولوی محمد باقر نے دہلی سے اردو اخبار جاری کیا۔ اس اخبار میں انگریزی عملداری پر نکتہ چینی کی جاتی تھی جو بعض اوقات طنز کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جب دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو محمد باقر کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ ان کے لڑکے مولوی محمد حسین آزاد کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا لیکن وہ بچ کر بھاگ نکلے۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کا اجرا ہوا۔ طنز و مزاح اپنی بھرپور شکل میں اسی پرچے سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ مولانا عبدالمجید سالک کا کہنا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی جتنے اخبارات نکلے قومی شکایت کے اظہار، حکومتی اقدامات کی تنقید، خبروں کی بہم رسانی اور پڑھنے والوں کی علمی اور ثقافتی خدمت میں برابر مصروف رہے۔ تاریخ صحافت اردو کے مصنف کی رائے ہے کہ ہندوستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ بدیشی انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کر سکتے تھے وہ انہوں نے پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی، اس کی زیادہ تر ذمہ داری گارساں دتاسی نے ان اخبارات پر عائد کی ہے۔ حیرت ہے کہ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات اور تقاریر میں کوئی بات کھل کر نہیں کی۔

جرأت کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

سمجھیں نہ امیر ان کو اہل تو قیر
انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر

مصحفی کا کہنا ہے

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اس سے پہلے کہ اودھ پنچ اور دوسرے ایسے اخبارات کا ذکر کیا جائے جنہوں نے جنگِ آزادی میں اردو طنز و مزاح کے ذریعہ حصہ لیا، چکبستؔ لکھنوی کی ایک نظم "لارڈ کرزن سے جھپٹ" کے کچھ شعر سنیئے۔ اگرچہ اسے نظم ظریفانہ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں مزاح۔ طنز۔ پھبتی۔ تضحیک۔ تمسخر۔ ہجو۔ سبھی پہلو نمایاں ہیں۔ حریت و آزادی کا لفظ آج سب جانتے ہیں۔ لیکن اُس زمانے میں یہ لفظ جرم خیال کیا جاتا تھا۔ لارڈ کرزن ایک جابر اور ظالم حکمران تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ایسی نظم کہہ جانا بہت دل گُردے کا کام تھا۔ چکبستؔ کی رگ رگ میں وطن پرستی کا جذبہ موجزن تھا۔ فرماتے ہیں۔

نشہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی بات
ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ
لیجئے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
سرخ غصہ سے کبھی زرد کبھی صدمہ سے
خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ
آئے ہیں آپ تو کچھ حضرتِ کرزن سنیئے
آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منہ پھٹ
آ گیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار
صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنی ہنوٹ
مانیے گا نہ بُرا آدمی ہیں آپ شریف
عالم نشہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ
جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دور تیرا
کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ
بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی
شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

تو ہو جانے پہ جو راضی تو قسم سر کی ترے
کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ
اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا
بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ
بیٹھ کرسئ وزارت پہ سنبھل کر پیارے
آہِ مظلوم نے شاہوں کے دیئے تخت پلٹ

چکبست "صبح امید" اخبار بھی نکالتے تھے۔ اور اس میں "رفتارِ قوم" کے بھڑکتے ہوئے مضامین قلمبند کرتے تھے۔ "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ یہ نظم منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے حسب فرمائش لکھی گئی تھی اور اودھ پنچ میں شائع بھی ہوئی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں نے تحریکِ آزادی کی جنگ لڑنے میں صحافیانہ شاعری سے کام لیا۔ برسوں قید فرہنگ میں رہے۔ روزانہ "زمیندار" کے ایڈیٹر تھے۔ ضمانتیں دیں۔ وہ ضبط ہوئیں۔ پریس ضبط کرائے لیکن پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ جلیانوالہ باغ کے جاں گسل سانحہ پر نظم کے چند اشعار دیکھئے۔

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی
تو قابل دید کے تھی اوڈوائر کی غضب ناکی
جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی
خدا کے قہر کی بجلی گرا کرتی ہے ظالم پر
مگر پنجاب میں اس برق کے مظلوم تھے شاکی

اور سنیئے

بلا کو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں
بچارے نے نہتوں پر دیا کب حکم فائر کا

مسلماں اور ہندو کو بھی ہے ناز اپنے سینے پر
اسے گو غرہ ہے بارود گولی کے ذخائر کا
کیا تھا بند رٹوبیڈ کو قفس میں نو مہینے تک
دیا تھا کاٹ پر سنسر نے اس بجلی کے طائر کا
کھلا جب قتل کی تفتیش کا دفتر ولایت کا
بغل میں لائے بستہ داب کر گاندھی نظائر کا

مولانا ظفر علی خاں اتنے نڈر اور بے باک تھے کہ حکومتیں ان سے خوف کھاتی تھیں۔

لالچند فلک کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ وہ مستند شاعر۔ ادیب اور صحافی تھے۔ افق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ کی نظم و نثر کی ۲۰ کتابیں ہیں۔ وطن پرستی کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی۔ سزا میں ۶ سال کی تخفیف ہوئی اور ۱۴ سال جیل کاٹ کر رہا ہوئے۔ جون ۱۹۱۷ء میں لاہور سنٹرل جیل میں لکھی گئی ایک مزاحیہ نظم کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ عمر بھر کی قید کی سزا اور گدگدی مستی کا یہ عالم۔ فرماتے ہیں۔

خوش ہو کے ہونج کوٹیں گے چکی چلائیں گے
کولھو۔ کنواں۔ خراس۔ خوشی سے بھرائیں گے
زنداں کی کچی روٹیاں خوش ہو کے کھائیں گے
اور ادھ بھنے چنے بھی خوشی سے چبائیں گے
درد و محن میں پھنس کے نہ گردن جھکائیں گے
مونچھوں پہ تاؤ دیں گے اکڑ بھی دکھائیں گے
روئیں گے بزدلی سے نہ آنسو بہائیں گے
اس رنج و بے بسی میں بھی ہمت دکھائیں گے
خود سہہ کے ظلم۔ ظلم کی ہستی مٹائیں گے
بھارت کے حالِ زار کو بہتر بنائیں گے

لالچند فلک نے لکھا ہے کہ انہیں مسٹر جیکب سپرنٹنڈنٹ جیل نے آکر کہا کہ لاٹ صاحب نے تم پر بہت مہربانی کی کہ تمہاری سزا ۶ سال کم کی ہے۔ تو انہوں نے چہرے پر شکن ڈال کر جواب دیا کہ "ہاں صاحب، بڑی مہربانی کی ہے۔ مجھ بے گناہ کے بیس سال چھین کر اس میں سے ۶ سال واپس کر دیئے ہیں۔ واقعی یہ بڑی مہربانی ہے۔ اگر قیصر غاصبانہ طور پر بلجیم کا ¾ حصہ اپنی سلطنت میں شامل کرے اور باقی ¼ حصہ البرٹ شاہ بلجیم کو واپس کر دے تو آپ اسے بھی قیصر کی بڑی مہربانی سمجھیں گے۔ آپ مہربانی کر کے لاٹ صاحب کو لکھ دیجئے کہ وہ اپنی مہربانی کو واپس لے لے۔ میرے نزدیک یہ کوئی مہربانی نہیں ہے۔"

جیل میں ہی انہوں نے ایک شکوہ آمیز غزل لکھی۔ اس کے کچھ اشعار دیکھیئے۔

میں نے ترے ملک کے حق میں دعائے خیر کی
تو نے پر مجھ سے چھڑایا ہے مرے گھر بار کو
میں نے کی امداد تیری تو نے ڈالا جیل میں
کون بتلائے گا اچھا تیرے ان اطوار کو
مان کر بکواس کچھ لونڈوں کی مجھ کو دی سزا
جانچ کر دیکھا نہ خود میری روش رفتار کو
ٹال دے میری بلا کو مجھ کو پنجرے سے نکال
دیکھنے دے مجھ کو پھر جا کر گل و گلزار کو
باغ بھارت میں چہکنے دے مجھے کچھ اور دن
بند پنجرے میں نہ کر مجھ مرغ خوش گفتار کو
قید بیڑیاں مونج چکی کی نہیں پروا مجھے
سر دو یا یک ٹال دے گا میری ہر بیگار کو
آسرا ہے مجھ کو اس پرماتما کا اے فلک
سہل کر دیتا ہے جو ہر سخت و مشکل کار کو

جولائی ۱۹۱۹ء میں جیل میں ہی ایک اور نظم لکھی۔ اس کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

فارغ البالی ۔ توانا ۔ ظالموں کے واسطے
تنگ دستی ۔ مفلسی ۔ مظلوم ہستوں کے لیے
بندگانِ صبر و طاعت کے لیے فاقہ کشی
ناز و نعمت ۔ سرکشوں ۔ دولت پرستوں کے لیے
اہلِ صدق و زہد کی خاطر دریدہ گودڑی
پوششِ رنگیں اباشوں خود پرستوں کے لیے
حق پرستوں کے لیے ہے جیل اور پھانسی فلک
اور تخت و تاج ہے باطل پرستوں کے لیے

شورش کاشمیری بلا کے مقرر تھے۔ قید فرنگ میں رہے۔ بہت نڈر اور بیباک صحافی اور شاعر تھے۔ ایک نظم کے چند طنزیہ شعر دیکھئے۔

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے
خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں
خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں
از افق تا بہ افق خوف کا سناٹا تھا
رات کی تمہید میں خورشید کی تنویریں تھیں
رہنماؤں کے لیے حکمِ زباں بندی تھا
جرم بے جرم کی پاداش میں تقریریں تھیں
جانشینانِ کلائیو تھے خداوندِ مجاز
سرِ توحید کی برطانوی تفسیریں تھیں

حیف اب وقت کے غدار بھی رستم ٹھہرے
اور زنداں کے سزاوار فقط ہم ٹھہرے

سردار امر سنگھ حضور کا ذکر بھی کم ہوتا ہے۔ وہ ایک مستند شاعر، بیباک اور نڈر صحافی تھے۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ لارڈ لارنس کا بت ہٹانے کے لیے اہلِ پنجاب نے ایک سرگرم کوشش کی تھی۔ مگر حکومتِ وقت کے غداروں کی مدد سے اس تحریک کو دبانے میں کامیاب رہی۔ منصور نے ایک طنزیہ اچھالا۔ یہ نظم ان کے پرچے "شیرِ پنجاب" جون ۱۹۲۲ء میں چھپی تھی۔ کچھ شعر دیکھئے۔

تلوار سے مانوگے حکومت کہ قلم سے
لارنس کا بت کہتا ہے ہر روز یہ ہم سے
تلوار بھی ہم کو وہ دکھاتا ہے قلم بھی
کیا دیکھنا پڑتا ہے ہمیں بخت دژم سے
تلوار سے ڈرتے ہیں نہ جھجکتے ہیں قلم سے
سیکھے کوئی دونوں کا چلانا ابھی ہم سے
شیرانِ وطن جاگے تو غیروں کے وطن میں
تلوار سے مانیں گے حکومت نہ قلم سے

تلوک چند محروم کو وطن کے خادموں اور سرفروشوں سے گہری عقیدت رہی ہے۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ بڑا دردناک ہے۔ محروم نے انگریزوں کے ظلم اور استبداد کے خلاف جو طنزیہ نظم لکھی اس کے کچھ شعر دیکھئے۔

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک
یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے
تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ

ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیاں
ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا

جوش ملیح آبادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے " مخاطب کیا۔ اس طنزیہ نظم کے کچھ شعر دیکھئے۔

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
اِک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کو سرخی کی ضرورت ہے تمہارے خون کی

میلارام وفاؔ کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ مقتدر شاعر تھے۔ قید فرنگ میں رہے ان کی ایک مزاحیہ اور طنزیہ نظم " فرنگی سے خطاب " نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس پر " ویر بھارت " کو بہت مصیبت اٹھانی پڑی تھی۔ کچھ شعر دیکھئے۔

اے فرنگی کبھی سوچا ہے یہ دل میں تو نے
اور پھر سوچ کے کچھ تجھ کو حیا بھی آئی
نامبارک تھا بہت ہند میں آنا تیرا
قحط آیا ترے ہمراہ وبا بھی آئی
تیرے قدموں سے لگی آئی غلامی ظالم

ساتھ ہی اس کے غریبی کی بلا بھی آئی
بن گئی باد سموم آہ اثر سے تیرے
اس چمن میں جو کبھی بادِ صبا بھی آئی

جام لبریز رہا زہرِ ہلاہل سے ترا
کبھی اس میں لیے اندوہ ربا بھی آئی
غم نصیبوں کے تو نالے سُنے تو نے لیکن
کبھی کانوں میں مسرت کی صدا بھی آئی
دردِ افلاس کا تیغوں سے کیا تو نے علاج
موت بن کر ترے ہاتھوں میں شفا بھی آئی
تیری سنگینیں چمکنے لگیں سڑکوں پہ جونہی
لب پہ مظلوم کے فریاد ذرا بھی آئی
الغرض شورِ تظلّم کے دبانے کو تجھے
کوئی تدبیر تشدّد کے سوا بھی آئی

اس قسم کی نظمیں وہ عموماً لکھتے تھے جو باقاعدگی سے شایع ہوتی تھیں۔
نوبہار صابر کا قومی اور وطنی نظموں پر مشتمل ایک مختصر شعری مجموعہ " پیامِ بیداری" ۱۹۳۲ء میں حکومتِ برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔ ایک نظم کے چند طنزیہ شعر دیکھیے۔

کبھی او بے خبر تحریکِ آزادی بھی رُکتی ہے
بڑھا کرتی ہے اس کی تیزیٔ رفتار پھانسی سے
نظر آئیں گے ہر سو شمع آزادی کے پروانے
ہزاروں مردہ دل ہو جائیں گے بیدار پھانسی سے

اکبر الٰہ آبادی سرکاری ملازمت میں تھے۔ وہ کھل کر کوئی بات نہیں کہہ سکتے

تھے۔ پھر بھی دبی دبی آوازیں وہ بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں یہ برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے

اسمٰعیل میرٹھی کی نظم کورانہ انگریز پرستی" میں طنز دیکھیے۔ کچھ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

رہا وہ جرگہ جسے چر گئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار
جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

احمق پھپھوندوی ایک ممتاز مزاح نگار ہیں۔ دیکھئے کیا پھلجھڑی چھوڑتے ہیں۔

یہ قتل و خون۔ یہ جنگ وجدل۔ یہ جور وستم یہ بغض وحسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب۔ باقی ہے اگر راج انگریزی
شدھی ہے کہیں تبلیغ کہیں، ناقوس کہیں تکبیر کہیں
یہ بیج نہ ہوں تو مشکل ہے دم بھر کے لیے راج انگریزی

وطنی اور قومی نظموں کو کہنے والے شعراء کی تعداد بہت ہے۔ مثلاً آزاد۔ حالی۔ محمد اقبال۔ فراق گورکھپوری۔ شبلی۔ حسرت موہانی۔ محمد علی جوہر۔ ساغر نظامی۔ احسان دانش روش صدیقی۔ حفیظ جالندھری۔ علی سردار جعفری۔ جمیل مظہری۔ آنند نرائن ملا۔ آزاد انصاری۔ جعفر علی خاں اثر۔ علی جواد زیدی۔ کیفی اعظمی۔ افسر میرٹھی۔ سہیل۔ مجاز۔ جاں نثار اختر۔ محی الدین۔ فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ ساحر لدھیانوی۔ اختر الایمان۔ شمیم کرہانی۔ سیماب جگر۔ وامق۔ جمال۔ وجد۔ جگن ناتھ آزاد۔ دتاتریہ کیفی۔ سراج۔ کمال احمد صدیقی وغیرہ۔ لیکن زیادہ نظمیں سنجیدہ ہیں۔

صحافت کی طرف آیئے۔ "الہلال" کا لہجہ بڑا بیباک تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد خود

بھی نازک سیاسی معاملات پر طنز کرتے تھے۔ "ہمدرد" مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے نکالا تھا۔ جوہر بہت نڈر اور بے باک تھے۔ "زمیندار" طنزیہ شاعری میں پیش پیش تھا۔ فکاہی کالم ذوق شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ قریب قریب ہر پرچے نے فکاہی کالم جاری کر رکھے تھے۔ یہ کالم طنز و مزاح کے لیے مخصوص تھا۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاسی معاملات پر رائے زنی ہوتی تھی۔ لوگ خبروں سے پہلے اسی کالم کو پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک چراغ حسن حسرت۔ کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ سیاسی کشمکشوں کا ایک طویل دور انہوں نے دیکھا تھا۔ مہاشہ کرشن سیاست پر وہ طنزیہ تیر چلاتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ کرشن قلم سے نہیں تیشے سے لکھتا ہے۔ انہیں قید بھی ہونا پڑا تھا۔ ساگر چند گورکھا۔ نانک چند ناز۔ خوبی لال نیپالی۔ میکش حیدرآبادی۔ ناکارہ حیدرآبادی۔ حاجی لق لق۔ حمید نظامی فکاہی کالم لکھتے تھے۔ دیوان سنگھ مفتون بڑے نڈر اور بیباک صحافی تھے۔ وہ ہر بات پر حاوی تھے۔ والیانِ ریاست ان سے کانپتے تھے۔ بندے ماترم۔ ویر بھارت۔ پرتاپ۔ ملاپ۔ شیر پنجاب اور بہت سے پرچے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ویر بھارت کو تو یہ فخر حاصل تھا کہ اس کے ایک درجن سے زیادہ ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔

"بندے ماترم" ۲۰ راپریل ۱۹۳۴ء کا ایڈیٹوریل ملاحظہ فرمائیں :-

لیکن اگر گذشتہ ریکارڈ سے آئندہ کا اندازہ ہو سکتا ہے تو یہ کہنا ہوگا کہ مستقبل بہت زیادہ تاریک ہے۔ وہ کونسا جبر ہے جو سوشلسٹ حکومت کے وقت ہندوستان پر نہ کیا گیا تھا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کا ریکارڈ بطور سوشلسٹ وزیر اعظم جس قدر سیاہ ہے شاید ہی کسی کنزرویٹو وزیر اعظم کا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود تھامسن صاحب انگریز سوشلسٹوں یا انکے گرو گھنٹال میکڈانلڈ کو ہندوستان دوست قرار دیتے ہیں۔ تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

"بندے ماترم" ۱۸ رمئی ۱۹۴۲ء سے ایک اور اقتباس دیکھئے۔

ڈاکٹر انصاری وزیر ہند کو بتانا چاہتے ہیں کہ کتے صرف بھونکتے ہی نہیں، کاٹتے بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتے بھونکنے کے متعلق سر سیموئیل ہور نہیں بلکہ ونڈٹن کریڈٹ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے گاندھی جی کی گرفتاری کے وقت کہا تھا کہ گاندھی کو گرفتار کیا گیا لیکن ہندوستان میں ایک کتا بھی نہیں بھونکا۔ اس پر امرت بازار پتریکا نے نائب وزیر ہند کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں بھونکنے والے کتے نہیں بلکہ انگلستان میں بھونکنے والے کتے نہیں بلکہ انگلستان میں ایک عالی خاندان کتا ضرور بھونکتا سنائی دیتا ہے۔

"اودھ پنچ" اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا۔ انگریزی حکومت۔ مغربی تہذیب و تمدن اس کے تیروں کی زد میں آنے لگے۔ سجاد حسین نے کھلا خط سربستہ مضامین کی سرخی کے تحت مختلف وائسراؤں اور حکام کے نام جو خط لکھے ہیں وہ اخلاقی جرأت۔ بے باک صداقت اور سیاسی بصیرت کا اچھا ثبوت ہیں۔

اودھ پنچ میں کارٹون بھی چھپتے تھے اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ان کا تعلق زیادہ سیاست سے تھا۔ منشی پریم چند کی پانچ وطنی کہانیوں کا ایک مجموعہ "سوز وطن" شائع ہوا۔ جسے حکومت انگریزی نے خطرناک سمجھا اور اس کی کل کاپیاں بحق سرکار ضبط کی گئیں۔

آخر میں رام پرشاد بسمل کے اس لافانی شعر یا للکار کے ساتھ مضمون اختتام پذیر ہوتا ہے۔

"سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے"

ہندوستان کی تحریک آزادی میں

اردو طنز و مزاح کا کردار

ضیاء الرحمٰن صدیقی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک ایسی حد فاصل تسلیم کی جاتی ہے جہاں ایک دور کا خاتمہ ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز۔ یہاں سے ماضی کے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے آثار کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب ہم ہندوستان کی تاریخ میں "تحریک آزادی" کے باب کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں یہ باب خونی واقعات سے لبریز نظر آتا ہے اور اس قیامت صغریٰ کے حالات و کوائف بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

متعدد ہندوستانی اور انگریز مورخین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی آراء کا اظہار کیا ہے لیکن انگریز مورخین نے اس تحریک کو غدر، بغاوت اور فوجی شورش کے نام سے موسوم کیا ہے اور وہ کسی بھی پہلو سے اس جنگ کو آزادی کی جنگ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو ملک گیر سطح پر ہندوستان کے حریت پسند عوام اور سپاہ نے انگریز عملداری کے جبر و استبداد اور جور و ستم سے تنگ آکر انگریز سامراج کے خلاف جنگ کی شکل میں شروع کیا تھا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی غیر جانب دار مورخ انکار نہیں کر سکتا کہ اس جنگ کا مقصد محض ملک کی آزادی اور تہذیب کی حفاظت تھا۔ اس کے برخلاف انگریز ہندوستان پر اپنا تسلط جمانا اور آمرانہ نظام قائم کرکے عوام کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔

انگریزوں کے سفاکانہ رویے سے ہندوستانی عوام اور سپاہ متنفر ہو چکے تھے۔

انھوں نے انگریز عملداری کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ۳۱ رمئی اس کی تاریخ طے پائی اسی اثنا میں چربی والے کارتوس آئے اور ان کارتوسوں کو دیسی سپاہ کو استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ میرٹھ کے حریت پسندوں سے صبر نہ ہوسکا۔ ۱۰ رمئی کو منگل پانڈے نے ایک انگریز افسر پر گولی چلادی۔ نتیجہ کے طور پر قبل از وقت جنگ چھڑ گئی۔

پنڈت سندر لال اٹھارہ سو ستاون کے تناظر میں عوام کے جذبۂ آزادی اور قومی یکجہتی کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس ملک میں ہندو، مسلم اور سکھ اتحاد کی ایک خوبصورت اور چمکدار مثال تھی۔ کیونکہ ہزاروں ہندو، مسلم اور سکھ رہنماؤں نے اپنے مذہبی اعتقاد پر قائم رہتے ہوئے شہنشاہ ہندوستان کے جھنڈے کے نیچے کندھے سے کندھا ملاکر اپنے پیارے ملک کی آزادی کے لیے جنگ کی تھی۔"[1]

تحریک آزادی کے فروغ میں طنز و مزاح نگاروں نے اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ اس دور کے طنز و مزاح نگاروں نے اپنے قلم کی تلوار سے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ جب ہم طنز و مزاح کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو غالبؔ کے خطوط کے بعد اودھ پنچ (۱۸۷۷ء) کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اردو نثر میں طنز و مزاح کا باضابطہ آغاز صنف کی حیثیت سے "اودھ پنچ" سے ہوتا ہے۔ اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین نے طنز و مزاح میں لکھنے والوں کا ایک حلقہ تیار کیا تھا اس حلقے میں رتن ناتھ سرشارؔ، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برقؔ، احمد علی شوقؔ اور اکبر حسین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان قلم کاروں نے اس صنف میں خوب طبع آزمائی کی اور اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ اس دور کے حکمراں

---

[1] پنڈت سندر لال سن ستاون ۱۹۵۷ء ص ۲۱۰

طبقے اور انگریز عملداری کو ہدفِ طنز بنایا۔ اردو کے مستند ادیب اور طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی "اودھ پنچ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت ایسے وقت میں انجام دی جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمانِ سیاست پر بے چینی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری تقاضوں کو پورا کیا اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا اور ملک و قوم کی خدمت و تحفظ کے لیے متعدد سیاسی مضامین لکھے منشی سجاد حسین بذاتِ خود کانگریسی ذہن رکھتے تھے اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کرتے رہتے تھے۔"

اردو کے معتبر ادیب وزیر آغا اودھ پنچ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہینِ منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کے لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی" ــــ اور احمد الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبولِ خاص و عام ہیں .... اودھ پنچ میں "لوکل" اور "موافقت زمانہ" کے زیرِ عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے ان میں ملک کے سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔"[1]

سجاد حسین کے سیاسی مضامین میں "انڈے بچے والی چیل چلہار" "کھلے خط سربستہ مضامین، نیچر کا مارشل لا، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں،

---

[1] وزیر آغا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ص ۱۶۴

کہ ہوں وہ بھی بے قرار' بے مار کی توبہ' پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹیکل اقلیدس' ٹیکس کی رم' ابر کامل اور سرکار انگلشیہ' منہ لگائی ڈومنی گائے "تال بے تال' یہ مبارک جنگ کا چنڈو ہے' پولیٹیکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش' قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انھوں نے مزاح کے پیرائے میں حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جس وقت سیاسی رہنماؤں کے لیے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کے پیرائے میں پیش کیا گیا۔

سجاد حسین کا مضمون "انڈے بچے والی چیل چلہاڑ" اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت میں انٹی کانگریس کے نام سے ایک جماعت بن چکی تھی لہٰذا سجاد حسین انٹی کانگریس کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے' چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں' اور بی انٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموی ہی منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے۔ بولیں اور ہیچ کھیت بولیں"۔[1]

منشی سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے بحیثیت مدیر" اودھ پنچ " مختلف اوقات میں مختلف افسران بالا کو تحریر کیے تھے۔

خط کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"..... لارڈ چرچل جو بدقسمتی ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں

---

[1] "اودھ پنچ" لکھنؤ شمارہ ۲۰ نومبر ۱۸۹۹ء جلد سوم ص ۸

بجائے خود تیز آدمی ہیں۔ مگر کسی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے
معاملات ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ اور میری رائے میں
تم بھی اس کی...... یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم کی دست و برد سے
اعزاز قیصری کو محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے...![1]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

صاحبِ من ــ جب کسی قسم کی کارروائی کا مصمم ارادہ کرلیا جائے اور کچھ لحاظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع افہام و تفہیم گنجائش پند و عظ اس طرح غائب ہے جیسے پرِ ہما یا ہندوستان مگر دنیا کا کوئی عمل بے نتیجے رہ نہیں سکتا آج نہیں کل یہاں نہیں وہاں ضرور بالضرور سہ ضرور کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے ممکن کیا یقینی سہی کہ تم نے آہ و نالے کی طرف سے کانوں میں اونگلیاں بڑے زور سے ٹھونس لیں، حالتِ خستہ کی طرف سے آنکھ پھیر لی"[2]

اسی سلسلے کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برق ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ترجمے کیے ہیں لیکن ان کے چند ایسے مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ جن میں سیاسی اور ملکی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ان کا مضمون "البرٹ بل" خاص طور پر توجہ کا حامل ہے۔ "البرٹ بل" کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

"..... اختیار ملا مگر برائے نام۔ مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور رہو۔ ہندیو دشمنوں سے سبق لو کچھ کھو کے اب تو دیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اگر ہم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے،

---

[1] کشن پرساد کول " اودھ پنچ کے نورتن۔ منقول ادبی اور قومی تذکرے۔ جلد دوم ص ۲۱۰

[2] بحوالہ فرقت کاکوروی۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ص ۲۲۶

تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا۔"[1]

طنز نگاروں میں نواب سید محمد آزاد کا نام بھی خاص اہمیت رکھتا ہے وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی اور ظرافت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں انھوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان کی تحریروں میں "روئداد اجلاس" "خجان کونسل" اور گرم گرم تار کی خبریں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر لکھی گئیں ہیں۔

اس دور کا ایک اہم اخبار اپنچ تھا۔ جو پٹنہ سے جاری ہوا تھا اپنچ میں "سوال از آسمان و جواب از سلیمان" کے عنوان کے تحت ایک کالم شائع ہوتا تھا۔ اس میں انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔

اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح نگاروں کا عبوری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں مہدی الافادی، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر، جوش، ابو الکلام آزاد، سجاد انصاری، قاضی عبد الغفار اور ملا رموزی ایسے صاحب قلم تھے جنھوں نے اپنی ظریفانہ تحریروں کے ذریعہ مغربی تہذیب، مغربی افکار، مغربی سیاسیات اور برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کی سیاسی ہلچل اور مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔

میر محفوظ علی نے سیاسی مسائل پر متعدد مضامین لکھے۔ ان کے مضامین میں انجمن تجاہل عامیانہ کا غیر معمولی جلسہ، کارروائی جلسہ، حاجی صاحب کی تقریریں جنگ پر، بلبلانِ اسیر کی رہائی، مسٹر صاحب دین وغیرہ توجہ طلب ہیں۔

میر محفوظ علی، علی برادران کی رہائی پر اپنے ایک مضمون "بلبلانِ اسیر کی رہائی" پر لکھتے ہیں:

---

[1] کشن پرساد کول۔ اودھ پنچ کے نورتن۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۰

بچہ : اباجان یہ کیا کام کرتے ہیں ؟

باپ : اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں

بچہ : تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سلف لادیتے ہیں ؟

باپ : ہماری محبت تو انھیں ایسی ہے کہ اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ لیکن اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں۔

بچہ : تو کیا یہ بوجھ اٹھاتے ہیں ؟

باپ : (آنکھوں میں آنسو آ گئے) حقیقت میں بڑے بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں[1]۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں نئی نئی تحریکوں نے جنم لیا، نئے رجحانات سامنے آئے اور سیاست نے نیا موڑ لیا۔ مسلم لیگ کا قیام، ہندو مہاسبھا کا قیام، پہلی جنگ عظیم کا آغاز، ہوم رول لیگ تحریک، خلافت کمیٹی کا قیام، غرض کہ پورا ملک سیاسی بحران سے دوچار تھا اور ہندوستان کے حریت پسند عوام آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ایسے دور میں طنز و مزاح نگاروں نے اپنے قلم کے تیر و نشتر سے انگریز عملداری کی مخالفت کی۔

طنز و مزاح کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی ناگزیر ہے۔ مولانا جہاں صاحب طرز ادیب اور صحافی تھے وہاں وہ ایک اعلیٰ پایے کے طنز نگار بھی تھے ان کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کا اندازہ ایک وقیع اخبار "الہلال" اور "البلاغ" سے لگایا جاسکتا ہے۔ طنز و مزاح کے ذیل میں "الہلال" کا شذرہ افکار و حوادث میں انھوں نے انگریزوں کی جانبداری، بدعنوانیوں اور معاندانہ رویے کی طرف اشارے کیے ہیں۔ افکار و حوادث" کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے :

" اتنے میں خبر اڑی کہ ہز آنر کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا، اِنّا للہِ و

---

[1] عبداللیث صدیقی - آج کا اردو ادب - ص ۲۷۳

انا الیه راجعون قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور ان
نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ
کہیئے اس ناز ک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ
نہیں، شکست کا اعتراف ہے"۔[1]

ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا اخبار "ہمدرد" ایک اہم سیاسی اخبار تھا۔ اس اخبار میں انھوں نے متعدد سیاسی مضامین لکھے ان کے مزاحیہ مضامین میں "سائمن کمیشن" اور "سائمن کمیشن اور ہندوستان" خاص طور پر سامنے آتے ہیں
مضمون" سائمن کمیشن" میں لکھتے ہیں۔

"اگر کمیشن کا ہر رکن ہندوستانی ہوتا تب بھی ہمیں وہ کمیشن ہرگز قبول نہ ہوتا اس لیے کہ اگرچہ خوش دامن صاحبہ تشریف نہ رکھتیں تاہم آخری فیصلہ میاں بیوی کے ہاتھ میں نہ ہوتا۔ بلکہ ہندو مسلمان دونوں بیویاں بن جاتے اور سوکنوں اور بیرنوں کی طرح لڑتے اور فیصلہ میاں کرتے اگر ہم دونوں اتفاق واتحاد بھی کرتے تب بھی جب تک فیصلہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ ہوتا وہی عربوں کی مثل صادق آتی ہے کہ ہر کام میں گھر والی سے مشورہ لیا کرو مگر کیا کرو جو تم خود مناسب سمجھو"۔[2]

مولانا محمد علی جوہر کا ایک مضمون" سائمن کمیشن اور ہندوستان" کے عنوان سے ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اس مضمون میں لکھتے ہیں:

"حسرت صاحب (حسرت موہانی) چاہتے ہیں کہ کمیشن کا ایک ڈاکخانہ بنایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستورِ اساسی کے تیار ہونے تک، جسے حسرت صاحب اس کمیشن کے منہ پر پھینکنے کے

---

[1] رئیس احمد جعفری۔ افادات محمد علی۔ ص ۱۲۳

لیے ہم سے کہتے ہیں ۔ ہم ایک پوسٹ کارڈ ڈاکخانے میں ڈال دیں جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتے"۔ یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ ر فروری کی ہڑتال ہو سکتی ہے۔"[1]

طنز و مزاح کا عبوری دور ختم ہو جانے کے بعد جدید دور کا آغاز ہوتا ہے اس درو کے طنز و مزاح نگاروں میں عظمت اللہ خاں، عبدالعزیز فلک پیما، چراغ حسن حسرت شوکت تھانوی، کنہیالال کپور، رشید احمد صدیقی کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

عظمت اللہ خاں ایک سنجیدہ طنز نگار ہیں۔ وہ بڑی عمدگی اور شگفتگی سے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے مضامین بڑے دلچسپ اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کے مطالعے میں ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کے اس طرح کے مضامین میں "گڑیا خانہ" "ڈیڑھ اینٹ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مضمون "ڈیڑھ اینٹ" میں لکھتے ہیں۔

"مشہور ہے کہ کسی انگریز سے پوچھا گیا کہ آپ کو ہندوستان کا کون سا میوہ بھایا؟ تو اس ستم ظریف نے ایک لفظ میں لارڈ میکالے کی ساری ہندوستانی "ڈیڑھ اینٹ" کی تحقیقات بھر دی۔ اس نے ہنس کر صرف یہ کہا "پھوٹ"۔"[2]

مضمون "گڑیا خانہ" میں لکھتے ہیں :

"اب وہی ہندوستان ہے جہاں مادرِ وطن اور سوراج کی خاطر مہاتما اور مولانا جیل جانا فخر سمجھتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ محض وطن پرستی کی گڑیا کے

---

[1] محمد علی جوہر (مدیر) ہمدرد شمارہ ۲۹ جنوری، ۱۹۲۸ء

[2] بحوالہ کلیم الدین احمد۔ اردو ادب میں طنز و ظرافت۔ ص ۱۶۶

اشارے پر اور جیل خانہ کیا ہے ؟ برطانوی شہنشاہیت اور افسر شاہی گڑیوں کا ایک گورکھ دھندا ہے"۔[1]

میاں عبدالعزیز فلک پیما کا نام طنز و ظرافت کی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتا ہے ان کی نثر شگفتہ، لہجہ دلنشین اور متین ہوتا ہے۔ فلک پیماں کے مضامین میں اس دور کے عصری سیاسی مسائل اور جد و جہد سے بحث ملتی ہے۔ ان کے اس قسم کے مضامین میں "شملے کی سڑکیں" "عدالتیں" "شیطان اور بزرگ" خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ مضمون "عدالتیں" میں لکھتے ہیں۔

"پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں .... ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مندرجہ ذیل قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

چلو : پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو : کروڑی مل اور فاقے خاں

چلو : لالہ گروی مل اور مرہون الہٰی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد شروع ہوا تھا اور شاید قیامت تک رہے"۔[2]

مضمون "شیطان اور بزرگ" میں لکھتے ہیں۔

".... جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے نعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگریسی یا مہا سبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے۔ شیطان کے لیے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی"۔[3]

---

[1] بحوالہ کلیم الدین احمد۔ اردو ادب میں طنز و ظرافت۔ ص ۲۲۵

[2] عبدالعزیز فلک پیماں۔ مضامین فلک پیماں۔ ص ۱۲۹

[3] ایضاً ایضاً ایضاً

شوکت تھانوی کے مضامین "سودیشی ریل" اور "لکھنؤ کانگریس سیشن" اس عہد کے عصری سیاسی مسائل سے بحث بھی کرتے ہیں اور ان پر طنز بھی۔ ان میں طنزیہ پیرائے میں انگریزوں کی مخالفت کی گئی ہے۔ جس سے ہندوستانیوں کو اپنی غلامی کا احساس ہوتا ہے۔ کنہیالال کپور کا نام طنز و مزاح کی تاریخ میں بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انھوں نے طنز و مزاح کے تیر و نشتر سے انگریز حکومت کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ کنہیالال کپور گاندھی جی کی قربانیوں سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

"کمال کر دیا مہاتما جی نے
پورے تین ہفتے نہیں کھایا
روحانی طاقت ہے
اوتار ہیں

میں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا مہاتما کبھی مر نہیں سکتے۔ ایک دفعہ تو دنیا کو ہلا دیا۔

میں کہتا ہوں یہ ہے اصلی شجاعت'
یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان سے تمام بزدلوں کو چن چن کر مار دیا جائے تو ہندوستان آج آزاد ہو سکتا ہے"[1]

رشید احمد صدیقی کا نام اردو ادب میں بحیثیت مزاح نگار امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ہاں طنز و ظرافت کے پس پشت چند اصلاحی اور سیاسی مقاصد بھی نظر آتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہندوستانیوں کے دو پیدائشی حقوق ہیں ایک بلوغ اور دوسرا "سوراج""[2]

---

[1] کنہیالال کپور۔ شیشہ و تیشہ۔ ص ۲۲ - ۲۳

[2] رشید احمد صدیقی۔ مضامین رشید۔ ص ۲۲۴

اردو نثر میں طنزیہ اور فکاہیہ تحریروں کا جو سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع ہوا تھا اودھ پنچ کے قلم کاروں نے اسے باضابطہ صنف کی حیثیت دی "اپنچ" نے اس صنف کو ارتقائی منزلوں تک پہنچانے میں مدد کی اور مختلف طنز و مزاح نگاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کر کے اس کی تکمیل کی۔

اس حقیقت سے کوئی ذی علم انکار نہیں کر سکتا کہ اردو طنز و مزاح نگاروں نے اپنی گراں قدر تحریروں کے ذریعہ جنگ آزادی کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا۔

میں اور تحریکِ آزادی

گیانی مہر سنگھ

میرا جنم ضلع امرتسر تھانہ گوروکا جنڈیالہ جنڈوال میں ایک عام غریب کسان کے گھر ہوا۔ بچپن کی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ تعلیم پوری ہونے پر ۱۹۲۹ء میں سنت تیجا سنگھ جی ڈبل ایم۔ اے سے قریب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ سنت تیجا سنگھ جی وہ عظیم ہستی تھے جن کو انگریزوں نے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ دی تھی اور وہ ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ میں پڑھنے کے لیے گئے اور وہاں انہوں نے انقلابی جتھہ بندی بمدر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ لالہ ہردیال جو اُن دنوں یونیورسٹی میں لیکچرار تھے۔ اور دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں کے عالم تھے۔ سنت تیجا سنگھ جی کی تحریک سے ہندوستانی سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ سنت جی نے امریکہ میں جگہ جگہ گوردوارے قائم کیے اور خود ایک طرح سے بمدر پارٹی کے بانی بن گئے۔ اور انہی کی وجہ سے بابا وساکھا سنگھ جی بابا سوہن سنگھ بھکنہ اور اُن کے ساتھی بمدر پارٹی میں شامل ہوئے۔ انہی میں سے سب سے چھوٹی عمر کے سردار کرتار سنگھ سرابا تھے جن کو بغاوت کے الزام میں فیروزپور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

سنت تیجا سنگھ جی ایک مہان کرم یوگی۔ عالم اور سادہ لوح انسان تھے۔ اُن کی شخصیت نے میرے دماغ میں دیش کے لیے ایک چنگاری پیدا کی۔ سردار بھگت سنگھ کی شہادت کے وقت پنجاب میں کافی ہلچل ہوئی۔ جگہ جگہ جلوس نکلے اور لوگوں نے ہڑتالیں کیں۔ میں اُن دنوں سنت تیجا سنگھ جی کے ساتھ راولپنڈی میں تھا۔ صدر

بازار میں سری گورو سنگھ سبھا کے گوردوارے کے سامنے کھڑے تھے۔ جب جلوس 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتا ہوا پاس سے گذرا تب مجھے پتہ نہیں ـــ میں کب ان نوجوانوں میں شامل ہوگیا اور نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ تھوڑی دور آگے جا کر پولیس نے چوک میں جلوس کو گھیر لیا اور تتر بتر ہونے کا حکم دیا اور اُس کے بعد لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ میرے ماتھے پر بھی چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ یہ دھرتی ماں کو میرا پہلا اُپہار تھا۔ پولیس نے سینکڑوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ جن میں سے میں بھی ایک تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں پندرہ بیس دن کے بعد ہم سب کو بغیر شرط کے رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۲۷ء تک میں نے سنتوں کی سنگت کی لیکن میری زندگی پر سب سے گہری چھاپ سنت ایشر سنگھ جی مہاراج راڑہ صاحب والوں کا پڑا۔ جن کا نظریہ تھا کہ جو انسان حق کا طرفدار ہوتا ہے اُس کو انسان کی سیوا کرنی چاہیے اور انسان کا تعلق دیش سے ہے اس لیے دیش کی سیوا کرنے والا ہی سچا خدا پرست ہو سکتا ہے۔ اس تحریک کے تحت میں ۱۹۲۷ء میں کلکتہ چلا گیا جہاں سردار نرنجن سنگھ طالب۔ ایڈیٹر دیش درپن کی تحریک سے پالٹیکس (سیاست) میں قدم رکھا۔ طالب صاحب باغی مہاراجہ نابھہ رِپو دمن سنگھ کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور اُنہی کے ساتھ نابھہ سے پہلے ڈیرہ دون۔ پھر کوڈائی کنال جہاں جس جگہ مہاراج نابھہ نظر بند تھے۔ رہ چکے تھے اور ان دنوں "روزانہ دیش درپن" کلکتہ کے ایڈیٹر و مالک بھی تھے۔ اُنہی کی توسل سے نیتاجی سبھاش چندر بوس کی قربتیں حاصل ہوئیں۔

جن دنوں میں کلکتہ میں تھا۔ بابا گوردت سنگھ۔ کاما گاٹا مارُو جہاز والے نے ایک جلسہ رکھا۔ جس میں دیش بھگت مہاراجہ نابھہ کو رہا کروانے کی مانگ کی۔ میں نے اس میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ پولیس نے زیر دفعہ 126A باغیانہ تقریر کے جرم میں مارچ ۱۹۲۸ء میں مجھے گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی پور 24 پرگنہ کلکتہ میں پیش ہوا۔ اور جس میں مجھے ضمانت پر رہا کرتے وقت میرے اوپر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ مقدمہ کے دوران میں شہر کلکتہ کی حدود سے باہر نہیں جا سکوں گا کبھی پبلک جلسہ

میں تقریر نہیں کر سکوں گا۔ پریس میں کوئی بیان نہیں دے سکوں گا۔۔۔ لیکن ان پابندیوں نے مجھے مزید کام کرنے کا وقت دیا۔ میں ٹریڈ یونین کے کام میں لگ گیا۔ مزدور جتھہ بندیوں میں بڑھ چڑھ کر کام کرتا رہا۔ جب میرا مقدمہ آخری دَور میں تھا۔ ۱۴ نومبر ۱۹۳۸ء کو گورو نانک مہاراج جی کے جنم دن کے دیوان میں سنگت کے زور دینے پر سردار نرنجن سنگھ طالب نے مجھے گورو گرنتھ صاحب کے شبد کی کتھا کرنے کو کہا۔ ۱۵ نومبر کی پیشی تھی۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پابندیاں توڑنے کے جرم میں میری ضمانت ضبط کر دی اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کر دیا اور جاری مقدمہ میں ایک سال سخت قید کی مزید سزا بڑھا دی۔

ساتھیوں کے لیے قربانی

علی پور سنٹرل جیل میں چٹاگانگ آرمری کیس کے ۲۰ سے زیادہ نوجوان قیدی تھے جن کو عمر قید کی سزا تھی۔ قاعدہ کے مطابق چودہ سال سے اوپر گذر جانے پر بھی انگریز ان کو رہا نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے رہائی کے مطالبے پر بھوک ہڑتال (مرن برت) شروع کر دی۔ اُس وقت میری قید کے صرف کچھ ہی دن باقی تھے۔ کیونکہ جیل کے قواعد کے مطابق میں لگ بھگ ۹ ماہ کی قید کاٹ چکا تھا اور بقایا قید کے دن معافی ملنی تھی لیکن اپنی رہائی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں نے ہمدردی میں بھوک ہڑتال شروع کر دی اور اتنی سختی سے بھوک ہڑتال پر عمل کیا کہ کچھ ہی دنوں میں میری صحت مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ اُن سیاسی قیدیوں نے جن کے نیتا کامریڈ اننتو سنگھ تھے۔ مجھے پیغام بھیجا کہ گیانی مہر سنگھ، ہم نے زندہ رہنے کے لیے ہڑتال کی ہے مرنے کے لیے نہیں اس لیے آپ کو زندہ رہنے کی کوشش کرنی ہے، مرنے کے لیے نہیں۔"

اس بھوک ہڑتال میں بڑے بڑے نیتا ملنے کے لیے آئے۔ جن میں شری ہربھل گھوش جو بعد میں بنگال کے چیف منسٹر بنے۔ ڈاکٹر بدھان چندر رائے اور راشٹریتی بابو راجندر پرشاد جو اُن دنوں کانگریس کے پردھان تھے، ہمیں دیکھنے اور سمجھانے کے

لیے آئے۔ جب کوئی اور بات بنتی نظر نہ آئی تو اُس وقت کے بنگال کے پرائم منسٹر مسٹر فضل الحق نے سبھاش بابو کو پیغام بھیجا کہ آپ کسی طرح اس بھوک ہڑتال کو ختم کرائیں۔ سبھاش بابو رات کے وقت جیل میں آئے اور اُن ساتھیوں کو اُن کی رہائی کے لیے اپنی طرف سے لڑائی کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے کہا کہ اگر انگریز نے آپ لوگوں کو رہا نہ کیا تو ہم آپ کے ساتھ آپ کے لیے جیل میں ہوں گے۔ اس بات پر بھوک ہڑتال ختم ہوئی اور سبھاش بابو نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا کہ جب تم باہر آؤ گے تو بہت سے کام تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کچھ ہی دنوں بعد کمزوری اور بیماریوں کا جکڑا ہوا جیل سے باہر آیا۔ اس بار پولیس کی نگرانی پہلے سے زیادہ سخت تھی۔ رات دن سپاہی میری رہائش گاہ کے باہر کھڑے رہتے تھے لیکن ہم اپنے کام بڑی ہوشیاری سے کرتے تھے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جہاں جانا ہوتا تھا۔ چلے جاتے۔ اور اُسی طرح واپس آجاتے۔

فوجی انقلاب کی تیاری

دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جنگ کی وجہ سے انگریزوں کی تمام تر توجہ یوروپ اور خاص کر انگلینڈ کی طرف لگی ہوئی تھی۔ انگریز ہر قیمت پر جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اُسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی مدد اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ ہندوستان کے عوام کو ساتھ لے کر پوری مدد اور ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کانگریس ہائی کمانڈ۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی۔ گورنر جنرل سے کئی بار ملاقاتیں کر چکے تھے لیکن انگریز آزادی کے لیے کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس ٹال مٹول کی پالیسی سے کانگریسی صفوں میں مایوسی تو تھی لیکن گاندھی جی اہنسا کا راستہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ جو صرف نعرے مار کر قید ہونے تک ہی محدود تھا.... نیتا جی سبھاش چندر بوس کو کانگریس کو چھوڑ چکے تھے اور فارورڈ بلاک نام کی سیاسی جماعت قائم کر چکے تھے۔ پھر بھی اُن کا حال تھا کہ جو عوامی تحریک کانگریس اور گاندھی جی کے بغیر

چلائی جائے گی۔ اُس کو کامیابی ملنی مشکل ہے۔ اس پر بھی سبھاش بابو نے مہاتما گاندھی جی کو ایک خط لکھ کر رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں جنگ آزادی کے لیے جب آواز دی جائے تو اُس میں سرکاری ملازم۔ پولیس اور فوج کو ساتھ لے کر جنگی سطح پر کام کیا جائے۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنی خدمات گاندھی جی کے سپرد کرنے کی پیش کش کی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ "اس کام میں مَیں شہید ہونے کے لیے تیار ہوں"..... لیکن گاندھی جی نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر بھی سبھاش بابو نے دل نہیں چھوڑا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ انگریزوں سے لوہا لینے کی بات سوچنے لگے۔ اس کام کے لیے سبھاش بابو نے دیش کے الگ الگ حصوں میں کچھ لوگ نامزد کیے۔ پنجاب کے کامریڈ اچھر سنگھ چھینہ پنجاب سے بھاگ کر کلکتہ آئے ہوئے تھے اور سردار نرنجن سنگھ طالب کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہی کے ذریعے بابا پارٹی نے پنجاب سے ملحق سرحدی صوبہ اور یوپی کی کئی چھاونیوں میں فوجوں کو ساتھ ملانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ ہندوستان کی فوجوں میں چودہ فیصدی سے زیادہ سکھ فوجی تھے اور پنجاب کی جاٹ برادری اور راجپوت فوجی بھی اُن کے ساتھ ہم آواز رہتے تھے۔ اس لیے سبھاش بابو کا خیال تھا کہ اگر سکھ فوجی انقلاب کے لیے جتھہ بند ہو جائیں تو باقی جماعتیں اپنے آپ ان کا ساتھ دیں گی۔ اس لیے بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ، ان تین صوبوں میں جب فوجوں کو ساتھ ملانے کی بات چلی تو طالب صاحب نے یہ ذمہ داری میرے (مہر سنگھ) اوپر ڈالنے کی بات کی۔ یہ سُن کر مجھے اتنی خوشی ہوئی جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ کلکتہ چھاونی۔ ولیم فورٹ میں کافی فوجی تھے۔ کلکتہ کے فوجی ہسپتال میں بنگال کی تمام چھاونیوں سے فوجی علاج کے لیے آتے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ ۲/۱۱ سکھ پلٹن جس کا ہیڈ کوارٹر چٹا گانگ (موجودہ بنگلہ دیش) میں تھا۔ ایک حوالدار بچن سنگھ اُن دنوں ہسپتال میں داخل تھا، اس سے بات ہوئی۔ بچن سنگھ نے چٹا گانگ کو جتھہ بندی کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ لیکن خواہش ظاہر کی کہ سبھاش بابو اُس کو اور اُس کے تین چار ساتھیوں کو جو اِس وقت یہاں ہیں، اپنی زبان سے یہ کام کرنے کو کہیں۔ اس کام کے لیے مہاراجہ نیپال کی کوٹھی

جو قلعہ کے بالکل پاس تھی اور ہمارے ایک ساتھی جتھے دار مولا سنگھ اُس کوٹھی میں رہتے تھے۔ اُنہی کی بیٹھک میں نیتاجی سبھاش چندر بوس، اُن کے پرائیویٹ سکریٹری ستو بخشی بمردار نرنجن سنگھ طالب اور میں (گیانی مہر سنگھ) بچن سنگھ اور اُن کے چار ساتھیوں کی ہے یہ فوجی اِتنے جذباتی تھے کہ وہ نیتاجی کے حکم دینے پر اپنی جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھتے تھے۔ بچن سنگھ نے کہا: "جب مرنا ہی ہے تو دیش کے لیے فخر و عزت کے ساتھ کیوں نہ مرا جائے۔" اُن کی خواہش پوری کرنے کے لیے نیتاجی نے مجھے ان کے پاس چٹا گانگ بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس کے پندرہ دن بعد مجھے چٹا گانگ جانے کا حکم ملا۔ میں نے کھادی کے کپڑے اُتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور چٹا گانگ کے کافی لمبے سفر پر روانہ ہوا۔ چٹا گانگ پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ چھاونی کا ایریا (AREA) میں کسی غیر آدمی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ چھاونی کے چاروں طرف بارہ فٹ اونچی خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہر وقت بجلی کا کرنٹ چلتا تھا۔ اس لیے سوائے مین گیٹ (MAIN GATE) کے اندر جانا مشکل تھا۔ دروازے پر کھڑا سنتری کچھ کر نہیں سکتا تھا کیونکہ دروازے کی چابی کیبن مین (CABIN MAN) کے پاس ہوتی تھی۔ لیکن اس سنتری (جو عمل سے ہمارا ساتھی معلوم ہوتا تھا) نے کہا کہ اگر تھوڑا سا خطرہ مول لے سکو تو میں انتظام کر دیتا ہوں۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد فٹ ڈیڑھ فٹ کی پھٹیاں لے آیا اور اوپر اور نیچے والی تار کے اوپر اور نیچے والی تار کے ساتھ رکھ کر مجھے ان کے درمیان سے نکلنے کے لیے کہا۔ یہ خطرناک کام تھا۔ لیکن دیش کے لیے یہ خطرہ میرے لیے تب ایک معمولی بات تھی۔ اس لیے میں بڑا چوکس رہ کر اُن پھٹیوں کے درمیان سے گذر گیا۔ حیرانی کی بات تھی کہ وہ فوجی منٹوں میں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ جیسے کہ وہ لوگ پہلے ہی اس بات کے لیے تیار تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن فوجیوں میں دیش پیار کا جذبہ حد سے پار ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم نے اپنی سب بات طے کر لی ابھی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ اُس پلٹن کا صوبیدار میجر دُور سے آتا ہوا نظر آیا۔ سب فوجی اپنی اپنی بیرکوں میں چلے گئے۔ کیونکہ وہ کٹر قسم کا انگریز سرکار کا وفادار تھا۔ اُس

صوبیدار کے آنے سے پہلے بچن سنگھ نے اپنے ایک بھائی۔ اُس کے پتا کا نام۔ اپنے گاؤں کا نام وغیرہ وغیرہ مجھے بتلا دیا تھا اور خوش قسمتی سے میں اُس گاؤں کے بہت سے آدمیوں کو جانتا تھا اور مزے کی بات یہ کہ آنے والا صوبیدار میجر بھی اُسی گاؤں کے نزدیک کا تھا۔ صوبیدار میجر نے مجھے اندر آنے کے بارے میں پوچھا لیکن اُس کی تسلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں چلنے کے لیے کہا۔ دفتر میں کرنل اور اس کے دو افسر دو چار منٹ بات کرتے رہے: بچن سنگھ میرے پاس کھڑا تھا اُس نے میرے کان میں کہا۔ گھبرانا نہیں ورنہ تمہارے ساتھ ہم سب مارے جائیں گے اور پھر ایک طرح سے فوجی عدالت لگ گئی۔ وہ افسر کافی ہوشیار تھے۔ ایک افسر نے مجھ سے پر کھی سوال کیے۔ میں نے انہیں بتلایا کہ میرا بھائی کلکتہ ہسپتال میں بیمار تھا۔ میں جب گاؤں گیا۔ تو گھر والوں نے رنگون نوکری پر جانے سے پہلے بھائی کی خبر لے کر چٹھی لکھنے کو کہا۔ کلکتہ سے بھائی واپس آ گیا اور میں اپنی چنتا دور کرنے کے لیے یہاں پہنچ گیا۔ افسر بار بار مجھ سے اوپر سوال کرتے اور سر سے پاؤں تک میری طرف دیکھتے تھے۔ آخر کار انہوں نے بے ضرر آدمی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یہ ایک طرح سے فوجی کچہری یا دوسرے لفظوں میں کورٹ مارشل سے میری رہائی کا حکم تھا۔ دفتر سے باہر نکلے تو صوبیدار میجر ہمارے ساتھ آیا۔ اور مجھسے کہنے لگا کہ انگریز بالکل بدھو ہے لیکن میں تجھے وہ نہیں سمجھتا۔ جو تم کہتے ہو اور ساتھ ہی سوال کیا: "گاندھی کو جانتے ہو؟" میں نے کہا "جانتا ہوں" "سبھاش چندر بوس کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔۔" جانتا ہوں۔۔۔۔ کیسے جانتے ہو؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔" جیسے تم جانتے ہو"۔۔۔ صوبیدار میجر نے کہا۔۔" میں انکو بیوقوف سمجھتا ہوں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔" میں اُن کو تو سمجھتا ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔" کیوں؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔" جس انگریز کے پاس فوج ہے توپیں ہیں۔ شکتی ہے اُن کے ساتھ چرخے کے ساتھ کیسے لڑائی لڑی جا سکتی ہے"۔۔۔ وہ صوبیدار میری بات کو سمجھ نہیں سکا۔ وگرنہ میں ایک طرح سے پھنس گیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں و نزدیکی گاؤں کی باتیں کرتا رہا اور کینٹین سے مجھے شاندار چائے پلا کر رخصت کیا۔ واپس آ کر میں جب

نیتاجی سے ملا اور میں جب اپنے بچ جانے کی بات کہہ رہا تھا تو میں رو پڑا اور کہا ۔۔
۔۔۔" سبھاش بابو ۔ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنے آپ کو دیش کے شہیدوں میں شامل نہیں کر سکا ۔ لیکن نیتاجی نے کہا کہ تم نے سوجھ بوجھ سے کام لے کر سینکڑوں دیش بھگت فوجیوں اور ہم سب کو بپتا کے مُنہ سے بچا لیا ہے" اور سر پر ہاتھ رکھ کر کہا " زندگی میں بہت سے کام ابھی باقی ہیں "۔

بنگال سے جلاوطن

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ سخت پہرہ کو توڑ کر ہم اپنا کام کرتے تھے ۔ پولیس یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ہم کچھ کر رہے ہیں ، کچھ نہیں کر سکتی تھی ۔ سبھاش بابو کو ہندوستان سے باہر بھیجنے کے لیے ہم نے جاپان کے دو سمندری جہاز والوں سے بات کی ۔ جاپان ابھی جنگ میں کودا نہ تھا ۔ بہت سے پروگرام بنتے تھے لیکن سر سے چڑھنے میں ابھی دیر تھی ۔
یوم آزادی ۲٦ جنوری ۱۹۴۰ء سر پر آ رہی تھی ۔ بھوانی پور ایریا میں ہم نے یہ دن پورے جوش سے منانے کی تیاری کی اور ہزارہ پارک کالی گھاٹ میں پبلک میٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا جس کی صدارت کرنے کے لیے نیتاجی کے بڑے سرت چندر بوس جی سے درخواست کی شام کے وقت بیس ہزار آدمیوں کی حاضری میں سرت بابو نے بنگلہ دیش میں پرن پتر پڑھایا اور ہندی میں مَیں نے پڑھوایا ۔ جلسہ برخاست کر کے جب باہر آئے ۔ تو پولیس کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (D.S.P) نے بنگال سرکار کی طرف سے ایک حکم دیا ، جس میں لکھا ہوا تھا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر بنگال سے نکل جاؤ اور سبھاش بابو کو خاموشی سے چلے جانے کی ہدایت کی ۔

شہید سردار شام سنگھ ۔ اٹاری ۔ اکالی کانفرنس

فیصلہ یہ ہوا کہ میرے ساتھی اٹاری کانفرنس پر امرتسر میں مجھے ملیں گے ۔ میں اکالیوں کی اندرونی پالیسی سے ناواقف تھا ۔ میری نظر میں اُس وقت یہ ۔۔۔ کانگریس ، اکالی اور

باقی دیش بھگتوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس کانفرنس نے میرے اور باقی دیش بھگت ساتھیوں کے بہت سے بھرم دور کر دیئے۔ اُس وقت عام چرچا تھی کہ کانگریس ایک آندولن چالو کرے گی جس میں فوجی بھرتی حرام اور انگریز کی مدد دیش سے غداری تصور کی جائے گی۔ اس کانفرنس میں اکالی کھُلے طور پر دو حصّوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ دیش کی آزادی کے لیے اگلی صفوں میں کھڑے ہو کر لڑنا چاہتا تھا جس کے لیڈر سردار پرتاپ سنگھ کیروں تھے اور اُن کے ساتھ سردار درشن سنگھ پھیرومان گیانی گورمکھ سنگھ مسافر اور بہت سے اور ساتھی تھے.... دوسری طرف گیانی کرتار سنگھ اور اُن کے نوجوان ساتھی فوج میں بھرتی کے حق میں تھے اور ساتھ ہی انگریز کی مدد کر کے آنے والے وقت میں راج ستا لینے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ گو درمیان میں تھے لیکن اُن کی ہمدردی عملی طور پر گیانی کرتار سنگھ کے ساتھیوں کے ساتھ تھی.... اکالی کانفرنس میں جو مدّے پیش کیے گئے اُن میں یہاں دیش کی آزادی کے لیے لڑنے کی تحریک کی تجویز تھی۔ وہاں انگریزوں سے فوجوں میں سکھوں کی تعداد چودہ فیصدی سے بڑھا کر بیس فیصدی کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی مانگ شامل تھی کہ جب انگریز ہندوستان سے جائے تو وہ راج کی ستا پنجاب میں سکھوں کے سپرد کرے۔ اِن تجاویز کے بارے میں کافی لے دے ہوئی۔ سردار پرتاپ سنگھ اور ان کے ساتھ گیانی گورمکھ سنگھ مسافر۔ سردار درشن سنگھ پھیرومان اور میں اس سب جیکٹس کمیٹی کی میٹنگ سے واک آؤٹ کر گئے۔ جتھے دار اودھم سنگھ ناگو کے کا گروپ جن میں جتھیدار تیجا سنگھ اکر پوری جو اُس کانفرنس کے پردھان تھے۔ بابو لابھ سنگھ جالندھر سردار لشر سنگھ مجھیل۔ جتھیدار سوہن سنگھ جلال عثمان شامل تھے۔ کانگریس کے ہمدرد تو تھے لیکن اُس وقت اکالی دَل کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھے۔ اس لیے ۱۹۴۰ء سے لیکر اگست ۱۹۴۲ء تک انفرادی ستیہ گرہ میں بہت سے ایسے اکالیوں نے بھی ستیہ گرہ میں حصہ لیا جو راجسی ستا میں پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اور پرتاپ سنگھ کیروں اور اور ان کے ساتھی اپنی صفوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُن کانگریسی اکالیوں سے دور نہیں

ہونا چاہتے تھے۔

(i) ۱۹۴۲ء کا بھارت چھوڑو آندولن

۷۔۸ اگست کو کانگریس کے کھلے اجلاس میں بھارت چھوڑو تحریک کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ مہاتما گاندھی اور کانگریس ہائی کمانڈ کے سب نیتا گرفتار ہو گئے۔ ۹ اگست کا دن دیش میں ایک طوفانی دن تھا۔ تمام دیش بھگت سر پر کفن باندھ کر میدان میں آ گئے۔ سرکار نے سختی سے کام لیا۔ عام طور پر تشدد ہو جانے پر گاندھی جی آندولن واپس لے لیتے تھے۔ اس بار یہ بات نہ تھی۔ گاندھی جی کا فرمان تھا۔ ۸ اگست کا پرستاؤ میری آتما ہے جو امر ہے اور واپس لینے کا سوال ہی نہیں ہے۔

اس دوران میں کشمیر گیا ہوا تھا میں نے اور سکول و کالجوں کے لڑکوں نے ڈاکٹر گوپی چند جی سے جلسہ کرنے کی درخواست کی انہوں نے کہا یہ نوجوانوں کی لہر ہے اس میں آپ گیانی مہر سنگھ کو بلا لیں۔ ہر طالب علم سکول کالج چھوڑے اور سرکاری ملازموں کو نوکری کرتے ہوئے سرکار کو لکھ دینا چاہیے کہ وہ بھارت کے نوکر ہیں انگریز کے نہیں۔ میرا من کہتا تھا کہ کاش سبھاش بابو کی بات مان کر اُس وقت ہی یہ پرستاؤ پاس ہو جاتا تو انگریز اپنے گھر چلا جاتا۔ بھارتی فوجوں کو تحریک دینی ہی ایک بنیادی بات تھی۔ فوج اور پولیس کی بغاوت ہی انگریز کو مجبور کر سکتی تھی لیکن یہ بات ہمارے لیڈران بہت بعد میں سمجھ سکے تھے۔ میری تقریر کے فوراً بعد پولیس نے مجھے گھیر لیا اور ایک نوٹس دیا اور ساتھ ہی میرا سامان اپنی گاڑی میں رکھ کر جموں لے آئے اور پہلی گاڑی سے سیالکوٹ بھیج دیا۔ وہاں سے امرتسر آ گیا۔ اسی دن سردار پرتاپ سنگھ گاڑی سے آئے اور آتے ہی گرفتار کر لیے گئے لیکن انہوں نے یہ لڑائی میرے حوالے کی۔ میں نے امرتسر میں روپوش ہو کر کام شروع کیا۔ کرو یا مرو کے ماٹو بنا کر بازار میں لگوائے۔ شری اکال تخت پر شہر کے نیتا لوگوں کو بلایا اور فیصلہ کیا کہ لہر کو زور سے چلایا جائے۔

(ii) آزاد پنجاب پارٹی

پنجاب میں یہ خیال زور پکڑ رہا تھا کہ انگریز اب جا رہے ہیں۔ گیانی کرتار سنگھ ایک

درویش سیاست داں اور اکالی لیڈروں کا دماغ گنے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک نئی پارٹی "آزاد پنجاب پارٹی" کی بنیاد رکھی اور اس کام کے لیے انہوں نے تیجا سنگھ سمندری ہال میں ایک بہت بڑی کانفرنس کی۔ اس کانفرنس میں مَیں بنا بلائے شامل ہوا اور جب اُس میں یہ پرستاؤ پیش ہوا کہ آنے والے حالات کے پیشِ نظر سکھوں کو انگریز کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دینا چاہیے۔ اس کے خلاف آواز بلند کرنے والا میں واحد آدمی تھا۔ اور نوجوانوں سے میں نے یہ بات کہی کہ سکھ قربانی۔ تیاگ۔ اور تپ کے سہارے ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انگریز آج پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے وہ ہمیں سوچکمے دے رہا ہے۔ لیکن مطلب نکل جانے کے بعد وہ قربانی کرنے والے لوگوں سے ہی سمجھوتہ کرے گا اور ہمارے یہ نیتا لوگ سکھ قوم کی بے چارگی پر آنسو بہائیں گے۔ وقت کی مانگ ہے کہ وہ آگے بڑھ کر قربانی کریں اور جاتے ہوئے انگریزوں سے کوئی امید نہ رکھیں .... گیانی کرتار سنگھ جی نے کہا.... میں کانگریس کے ساتھ جیل جانے کی بجائے ایک ٹھگی چوری کر کے جیل جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

ساتھ ہی بڑی ملائمیت سے مجھے اس میٹنگ سے باہر چلے جانے کو کہا۔ ایک بہت بڑے جتھے دار نے مجھ سے کہا: "ہم تیرے کہنے پر گوردواروں کی مینجمینٹ (انتظامیہ) فیل (FAIL) نہیں کر سکتے۔ اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ہمیں تمہارا کوئی علاج سوچنا پڑے گا۔"....

اور اُسی رات جب میں شرومنی کمیٹی کے دفتر کے بالکل ساتھ بارہ دری مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اوپر سویا ہوا تھا تو پولیس کی بھاری فورس نے بارہ دری کو گھیرا ڈال کر مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے کپڑے پہن کر سڑک کے اوپر پہنچ کر نعرے مارے اور ان کے ساتھ چل کر گورو رام داس سرائے کے سامنے بہت ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں نے پورے پندرہ منٹ لوگوں کو آٹھ اگست کے پرستاؤ کے بارے میں بتایا۔ پولیس والوں کو ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے ایسا کرنے سے روک سکیں.... وہاں سے مجھے سیدھے امرتسر قلعہ میں لے گئے۔ اور قلعہ میں بند کر دیا۔

(iii) لاہور قلعہ

سارے ہندوستان میں لاہور قلعہ انگریز کا قصائی (بوچڑ) خانہ کے نام سے مشہور تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے وہاں بڑے بڑے انقلابی اور بہادر لوگ بھی گھبرا جاتے تھے۔ یہ جگہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اس میں تقریباً دس یا بارہ آدمی قیدی رکھنے کی گنجائش تھی۔ کمرے اس طرح بنائے گئے تھے کہ کوئی بھی قیدی دوسرے قیدی کے بارے میں نہیں جان سکتا تھا۔ رات کے وقت رونے چیخنے کی آوازیں ضرور سُنائی دیتی تھیں۔ مچھر اور کھٹمل اتنے زیادہ تھے کہ کوئی قیدی آرام سے سو نہیں سکتا تھا۔ مجھے جس کمرہ میں رکھا گیا اُس کی چوڑائی لمبائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھی لیکن ہر جانے والے کا خیال اپنے سے پہلے اُس کمرہ میں رہ چکے ساتھیوں کی طرف ضرور چلا جاتا تھا۔ میرے کمرے میں شہید سردار بھگت سنگھ۔ گیانی ہربنس سنگھ اور بجھتے دار اودھم سنگھ ناگو کے نام ان کی اپنے قلم سے دیوار پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تنہائی میں اُن کے پاس کوئی اور چیز نہ ہونے کی گواہی تھی۔ کیونکہ یہ نام اور لکھتیں (تحریریں) پتھر یا اینٹ کے روڑے سے لکھی ہوئی تھیں۔ میں اس قلعہ میں پورے ۹۰ دن رہا۔ تیرہ دن مجھے دن اور رات جاگنا پڑا۔ اور اس دوران مجھے تیز ملیریا بخار نے آگھیرا۔ بخار کی حالت میں بھی وہ (پولیس) مجھ سے پوچھ تاچھ کرتے رہے۔ ایک دن میں نے ان سے نہانے کرنے کے لیے کہا۔ کیونکہ ویسے ہی ایک چھوٹا سا گھڑا پانی تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ بخار کی حالت میں انہوں نے نہانے کی اجازت اس لیے دی کہ شاید بخار بڑھ جانے کی صورت میں یہ ہماری باتیں مان جائے گا۔ ویسے ان کو یہ پرواہ نہیں تھی کہ کوئی قیدی مر جائے گا۔ D.I.G, C.I.D ایک لمبا اور لنگڑا انگریز تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا ...." ہمیں تم سے جو معلوم کرنا ہے وہ کر کے ہی رہیں گے اور اگر مر جاؤ گے تو دریا بُرد کر دیں گے اور کسی کو پتہ بھی نہ ہوگا۔ تم کہاں ہو!!"۔۔ میری صحت اتنی گر چکی تھی کہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔

لاہور قلعہ سے مجھے نومبر ۱۹۴۲ء میں بطور سیکورٹی قیدی کیمبل پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ مجھ سے پہلے کیمبل پور جیل میں فارورڈ بلاک کے پریزیڈنٹ سردار سردول سنگھ جی کویشر سبھاش بابو کے دو بھتیجے، اروند کمار بوس اور دو جندر ناتھ بوس بھی وہاں تھے جس وارڈ میں ہم تھے یہ وارڈ سردار تیجا سنگھ سوتنتر شاہی قیدی کے لیے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ اس جیل میں مَیں نے پہلی بار سردار سردول سنگھ جی کویشر کو جب اپنی فوجی انقلاب کی بات سنائی تو وہ حیران رہ گئے اور جیل سے رہا ہونے کے بعد آل انڈیا فارورڈ بلاک کا جو اجلاس ناگپور میں ہوا اپنے پریذیڈینشل ایڈریس میں کہا.... "میں نہیں جانتا کہ ہماری استقبالیہ کمیٹی نے سردار نرنجن سنگھ طالب اور گیانی مہر سنگھ کو یہاں بُلایا ہے یا نہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نیتا جی نے ہندوستان میں رہتے ہوئے فوجی بغاوت کا جو پلان بنایا تھا اُس میں یہ دونوں (سردار نرنجن سنگھ اور گیانی مہر سنگھ) اُن (سبھاش بابو) کے معاونین تھے۔ اس لیے میں ان دونوں کو آزاد ہند فوج کی بُنیاد ڈالنے والے مہان پودھوں کا نام دیتا ہوں۔

مَیں ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو گجرات جیل سے رہا ہوا۔ آتے ہی میں نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے کی گئی غداری .... "جنتا کی جنگ" دیش گھاتک لہر کے خلاف جگہ جگہ جلسے کر کے پوری طاقت سے آواز بلند کی۔

آئی۔این۔اے۔ڈے (I.N.A. DAY)

دوسری جنگ اتحادی جیت چکے تھے۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس، ہوائی جہاز کے حادثہ کا شکار ہو چکے تھے۔ آزاد ہند فوج کے جو فوجی گرفتار ہوئے اُن میں سے انگریز نے تین آدمیوں۔ جنرل شاہنواز خاں۔ گوربخش سنگھ ڈھلوں اور سہگل کے اوپر لال قلعہ دلّی میں مقدمہ چلایا جانا تھا۔ اس بات نے سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جہاں اس کیس کو لڑنے کے لیے بھولا بھائی ڈیسائی جیسے قابل ترین مدبر وکیل کھڑے ہوئے۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلی بار بیرسٹری کا کوٹ پہنا وہاں ہندوستان کا ہر مدبّر

انسان ان کا معاون بنا جن میں سے ایک سر تیج بہادر سپرو بھی شامل تھے..... کانگریس نے ۷ رنومبر ۱۹۴۵ء کو آئی۔ این۔ اے۔ ڈے (جس دن دیوالی تھی) منانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس جلسہ میں جو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی زیر صدارت جلیان والا باغ میں ہوا۔ پہلی بار نیتاجی سبھاش چندر بوس کی ہندوستان سے باہر جانے کی کہانی بیان کی اور جب میں نے نیتاجی کی وہ بات دُہرائی"۔ تم مجھے خون دو۔ میں تمہیں آزادی دوں گا"۔ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا۔" مجھے خون چاہیے۔خون .... اور خون کا ایسا بہاو جس میں انگریز بہہ جائیں"..... جلسہ رات کے ایک بجے ختم ہوا۔اور مجھے وہیں سے پولیس نے گرفتار کر لیا اور امرتسر قلعہ میں لے گئی..... یہ کیس میرا دیش آزاد ہونے کے کافی عرصہ بعد سٹی مجسٹریٹ امرتسر کی عدالت سے خارج ہوا۔

مسلم لیگ کا ڈائرکٹ ایکشن ڈے

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں پھر بنگال چلا گیا۔ سرکار نے جلاوطنی کا حکم واپس لے کر مجھے ہاوڑہ ریلوے سٹیشن پر اطلاع دی۔ میں کلکتہ کی سیاست میں سرگرم ہوا۔ اسی دوران جب کانگریس اور مسلم لیگ یعنی مہاتما گاندھی اور مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے بارے میں کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو مسٹر جناح نے ڈائرکٹ ایکشن ۱۹ راگست ۱۹۴۶ء کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو سارے ہندوستان میں چھوٹے موٹے واقعات ہوئے۔ لیکن بنگال میں مسلم لیگ کی اپنی وزارت تھی جس کے پرائم منسٹر حسین شہید سہروردی تھے۔ ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ ہندو حلقوں میں ہزارہا مسلمان مارے گئے اور مسلم علاقوں میں ہندو مارے گئے۔ کروڑوں روپوں کی جائداد جل کر راکھ ہوئی۔

۱۹ راگست ۱۹۴۶ء رات کے آٹھ بجے میں نے بیس ٹرک سکھوں کے بھر کر جلوس نکالا۔ ان کے آگے میں جیپ میں سردار رنجیت سنگھ گریوال۔ سردار دیا سنگھ ٹرندی۔ سردار امر سنگھ ناشاد کے ساتھ جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اور نہ سارے رستہ میں ہم نے کوئی نعرہ لگایا۔ ہمارا مقصد امن اور خاص کر عوام کی

جان مال کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس جگہ سے ہم گذر گئے۔ وہاں پھر فساد نہیں ہوا۔ بڑا بازار میں انگریز کمشنر پولیس کافی فورس لیے کھڑا تھا جس نے ہم سے کہا.... "کرفیو لگ گیا ہے۔ اس لیے آپ آگے نہیں جا سکتے".... میں نے کہا.... "میں راجہ بازار (جس کو اب گاندھی بازار کہا جاتا ہے) کے گوردوارے کو دیکھنا چاہتا ہوں اور سکھ عوام سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہر طرح سے جتھے بند ہوکر فسادیوں کا مقابلہ کریں اور اپنے پڑوسیوں کی جان مال کی رکھشا کریں۔ یہی ہمارا دھرم ہے..... میں جہاں جہاں جانا چاہتا تھا سب جگہ میں نے تقاریر بھی کیں۔ یہاں تک کہ ایک مسجد میں جہاں گوردوارہ اور مسجد آمنے سامنے تھے، مل کر رہنے اور فساد نہ کرنے کا لوگوں سے وعدہ لیا۔ واپس آکر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم نے لوگوں کے جان و مال کی رکھشا کرنی ہے اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کو سہارا دینا ہے۔ گوردوارہ جگت سدھار کالی گھاٹ میں بڑے بڑے لاؤڈ سپیکر لگا کر میں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ شری رام۔ شری کرشن۔ گورو نانک دیو۔ حضرت محمدؐ صاحب۔ یسوع مسیح۔ بھگوان گوتم بدھ۔ آخر کسی ماں کی اولاد ہی تھے جو آدمی معصوم بچے اور عورت پر حملہ کرتا ہے وہ اوتار۔ گورُو اور پیغمبروں کا قاتل ہے۔ کون جانتا ہے کس ماں کی گودی کون مہان ہستی کھیل رہی ہے۔

میری اپیل کا یہ اثر ہوا کہ ۲۰۰ نوجوان مسلم عورتیں اور بچوں کو لے کر گوردوارے میں اکٹھی ہو گئیں۔ ۲۲ر اگست کو بنگال سرکار نے امن قایم کرنے کے لیے ہندو مسلمان اور سکھ نمایندوں کی میٹنگ سیکرٹریٹ میں کی۔ اس میں بنگال کے تمام وزراء۔ شری پت شری سرت چندر بوس۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور شری بدھان چندر رائے۔ شری پربھلو گھوش جو بعد میں بنگال کے چیف منسٹر بنے، شامل تھے۔ میٹنگ میں بیٹھتے ہی بنگال کے پریمیئر حسین شہید سُہروردی نے طنز سے ہمیں مخاطب کر کے کہا...." سناؤ، سنگھ صاحب مسلمان تو خوب کاٹے ؟"..... یہ سن کر میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور کہا..."سہروردی صاحب! میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر آپ یہ ثابت کر دیں کہ کسی ایک جگہ کسی سکھ نے کسی ایک مُسلمان کو قتل کیا ہے تو میں اس جُرم کو اپنے اوپر قبول کر کے بذریعہ کورٹ

پھانسی پر لٹک جاؤں گا۔ ہم نے تندہی سے رات دن کام کر کے ہندو اور مسلمان ... کی سیوا کی ہے اور اُس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔ تین سو سے اوپر بے سہارا مظلوم مسلم نوجوان عورتیں اور ان کے چھوٹے بچے ہمارے جگت سدھار گوردوارے میں موجود ہیں "۔۔۔ یہ بات سُن کر تمام ہاؤس میں سناٹا چھا گیا۔ سہروردی نے گاڑیاں دیکر آدمی گوردوارے بھیجے۔ جنھوں نے آکر میٹنگ میں ہی میری بات کی نہ صرف تصدیق ہی کی بلکہ ساتھ یہ بھی کہا کہ جب تک وہ سردار (اشارہ میری طرف۔ مہر سنگھ گیانی کی طرف تھا) خود آکر ہمیں یہ نہیں کہتے کہ ہمیں ٹھیک جگہ لے جایا جا رہا ہے، ہم گوردوارہ نہیں چھوڑیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر سہروردی نے نہ صرف اس میٹنگ میں ہی بلکہ رات کو آل انڈیا ریڈیو کلکتہ پر اپنی اپیل میں سکھوں کی تعریف کی اور ساتھ ہی بے گناہوں کی رکھشا کرنے کے لیے سکھوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔۔۔۔ اس میٹنگ میں ایک اپیل شائع کی گئی۔ جس میں کانگریس مسلم لیگ۔ ہندو مہا سبھا کے بڑے بڑے نیتاؤں کے دستخط تھے اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس اپیل پر حسین شہید سہروردی شیاما پرشاد مُکرجی۔ سرت چندر بوس کے ساتھ گیانی مہر سنگھ کے دستخط بھی تھے جو آل انڈیا ریڈیو کے ریکارڈ میں آج بھی موجود ہے۔

"جنگ آزادی میں اردو زبان کا حصہ"

کے موضوع پر ہریانہ اردو اکادمی نے جو ادبی سمینار منعقد کیا وہ اکادمی کا ایسا تاریخی کارنامہ ہے جس کی وسعتیں ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آزادی کے جہاد میں ہمارے بزرگوں نے جس حب الوطنی کا پیغام دیا تھا آج اس کی پھر ضرورت ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی نے اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زیر نظر کتاب کی اشاعت کا جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ قابل صد تحسین ہے میں اس کتاب کی مقبولیت کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں

بھاگ مل

پارلیمنٹ سکرٹری ہریانہ

ہندوستان کی قومی زبانوں میں اردو کی یہ نمایاں انفرادیت ہے کہ اس نے ملک کی جنگ آزادی میں قابلِ فخر کردار نبھایا ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے وطن پرستی کے جذبات کو تقویتیں عطا کی ہیں اور سرفروشانِ وطن کو انقلاب زندہ باد جیسا ولولہ انگیز نعرہ دیا ہے — اردو نے آزادی کے جہاد میں جن قابلِ تعظیم مجاہدوں کو پیش کیا ان میں رام پرشاد بسملؔ، بھگت سنگھ، راجگورو اور سکھدیو جیسے محبانِ وطن ہماری قومی تاریخ کا جزوِ افتخار ہیں۔ تحریک آزادی کے دوران اردو پر برطانوی سامراج کی خصوصی نظر رہتی تھی۔ اردو کا بہت سا ادب اسی زمانے میں ضبط کیا گیا تھا۔

آج آزادی وطن اور اردو کے لازم و ملزوم رشتے کو واضح کرنے کی اہم ضرورت ہے مجھے دلی مسرت ہے کہ اس ضرورت کو ہریانہ اردو اکادمی نے تاریخی سیمنار منعقد کر کے کافی حد تک پورا کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں جو مقالے شاملِ اشاعت کئے گئے ہیں۔ ان کی دستاویزی اہمیت ہے۔ میں اس اشاعت پر ہریانہ اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سید مظفر حسین برنی
(سابق گورنر، ہریانہ)